اجراء حسبِ ارشاد: شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانوی قدس سرہ

مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۳ | ربیع الثانی ۱۴۴۴ھ | نومبر ۲۰۲۲ء | شمارہ ۱۱

اَسرار العبادة

(عبادت کے اسرار) قسط اوّل

از افادات

حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
35422213
35433049

پتہ دفتر: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

اَسرار العبادۃ

(عبادت کے اسرار) قسط اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے وعظ میں مذکور آیت پر تین وعظ ارشاد فرمائے پہلا العبادہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ حکیم عبدالرحیم صاحب کے گھر ترب بازار حیدر آباد دکن میں جس میں سامعین کی تعداد ۱۰۰ تھی علاوہ عورتوں کے، یہ وعظ دارالعلوم سے مئی ۲۰۰۷ میں طبع ہوا۔ دوسرا وعظ اسی آیت پر آثار العبادۃ کے نام سے ۲۷ ذی الحج ۱۳۴۱ھ بروز شنبہ بعد نماز عشاء مدرسہ نظامیہ شبلی گنج حیدر آباد دکن کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا سامعین کا مجمع ۴۰۰۰ تھا دارالعلوم سے یہ وعظ مارچ/اپریل ۲۰۱۷ء میں طبع ہوا اور تیسرا وعظ ''اسرار العبادۃ'' ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تینوں وعظ عبدالحلیم صاحب نے قلم بند کئے اور حاجی محمد یوسف صاحب نے ان کی معاونت کی اسرار عبادت کے متعلق یہ وعظ مدرسہ انوار العلوم نام پلی حیدر آباد دکن میں بروز شنبہ بعد فجر مورخہ ۱۴ محرم ۱۳۴۲ھ کو کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو سوا چار گھنٹے میں ختم ہوا۔ حاضرین کی تعداد تین ہزار تھی۔

تینوں مواعظ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں عبادت کے تمام پہلوؤں پر کلام فرمایا ہے اللہ تعالیٰ قارئین کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

نوٹ: یہ کافی طویل وعظ ہے اس لیے دو اقساط میں شائع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

خلیل احمد تھانوی

۲۵ ذیعقدہ ۱۴۴۳ھ/ ۲۵ جون ۲۰۲۲ء

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	تمہید.....	۷
۲.....	عقائد کا استحضار.....	۸
۳.....	درجات عقائد.....	۹
۴.....	عبادت کی حقیقت.....	۹
۵.....	مسئلہ طلاق و میراث.....	۱۰
۶.....	بہنوں کے وراثت چھوڑنے کا حکم.....	۱۱
۷.....	بھائی کو وراثت ہبہ کرنے کی شرائط.....	۱۳
۸.....	چندہ کی رسم.....	۱۴
۹.....	چندہ وصول کرنے والوں کے عذر کا جواب.....	۱۵
۱۰.....	زبردستی کی نماز.....	۱۶
۱۱.....	قبولِ دعوت میں بے احتیاطی.....	۱۶
۱۲.....	صحابہؓ کی بے تکلفی.....	۱۷
۱۳.....	حکایت.....	۱۹
۱۴.....	جبری چندہ.....	۲۱
۱۵.....	آج کل کے مجتہدین.....	۲۲
۱۶.....	مسلم و غیر مسلم کے مال کا فرق.....	۲۴
۱۷.....	مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق.....	۲۵
۱۸.....	تقسیم وراثت میں احتیاط.....	۲۷
۱۹.....	اختیاری غلامی.....	۲۷
۲۰.....	حکایت.....	۲۸

۲۱.....	زمین وآسمان اور دیگر مخلوقات کا ادراک وعبادت.....	۳۰
۲۲.....	نظیر اور ثبوت کا فرق.....	۳۲
۲۳.....	نئی ایجادوں سے تائیدِ دین.....	۳۳
۲۴.....	زمین کے بولنے کی نظیر.....	۳۴
۲۵.....	موجد حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں.....	۳۵
۲۶.....	حقیقت وحدۃ الوجود.....	۳۶
۲۷.....	وحدت الوجود کی مثال سے وضاحت.....	۳۷
۲۸.....	جاہلانہ تواضع.....	۳۹
۲۹.....	وحدت الوجود کی مقبولیت اور مردودیت کا معیار.....	۴۰
۳۰.....	حل اشکال.....	۴۱
۳۱.....	ادراک ارض وسماء.....	۴۲
۳۲.....	حیوان عاشق.....	۴۲
۳۳.....	حیوانات کا شعور.....	۴۳
۳۴.....	خالق ومخلوق کے معاملات کا موازنہ.....	۴۴
۳۵.....	نعمت کی ناقدری کا وبال.....	۴۵
۳۶.....	رحمت خداوندی.....	۴۶
۳۷.....	حقیقتِ اسباب.....	۴۶
۳۸.....	شریعت کی برکات.....	۴۷
۳۹.....	جبریہ کا انجام.....	۴۸
۴۰.....	اخبار الجامعہ.....	۵۰

❁❁❁

❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ و نشھد انّ سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ اٰلہ و اصحابہ و بارك وسلم **اما بعد!**

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَٱعۡبُدۡهُ وَٱصۡطَبِرۡ لِعِبَٰدَتِهِۦۚ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهُۥ سَمِيّٗا (۱)

تمہید

یہ وہی آیت ہے جو اس سے قبل کے جلسہ وعظ میں تلاوت کی گئی تھی اور اس جلسہ میں یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے قبل بھی اسی کی تلاوت ہو چکی ہے۔ گویا آج تیسری بار اس کی تلاوت کی گئی ہے (۲)۔

وجہ یہ ہے کہ ان دونوں جلسوں میں اس کے متعلق بیان مکمل نہ ہوا تھا اس واسطے حاجت اعادہ (۳) کی ہوئی تا کہ اس مضمون کی کسی قدر تکمیل ہو جاوے اور کسی قدر اس لیے کہا کہ پوری تکمیل کے لیے تو مدت دراز چاہیے۔ حتی کہ تکمیل عرفی کے لیے بھی۔ باقی تکمیل حقیقی کے لیے تو تمام عمر بھی کافی نہیں مگر خیر ''مالا یدرك کلہ لا یترك کلہ'' (۴)

(۱) ''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ سو تو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ، بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے'' سورۂ مریم: ۶۵ (۲) اسی آیت پر دو وعظ پہلے بیان ہو چکے ہیں ایک العبادۃ دوسرا آثار العبادۃ یہ تیسرا وعظ اسرار العبادۃ ہے (۳) دوبارہ بیان کی ضرورت ہوئی (۴) ''تم اگر کُل کو نہ پا سکو تو کُل کو بھی بالکل بالکل چھوڑ و بھی مت''

کے قاعدہ پر جتنی تکمیل بھی اس مختصر وقت میں ہوسکتی ہو تو کر دینا چاہیے۔ بس ایسی حالت میں یہ تکمیل گویا بقدر ضرورت ہی ہوگی۔ یعنی جن امور مہمہ (۱) کی طرف توجہ نہیں رہی ان کی طرف متوجہ کر دیا جاوے گا کیونکہ اصل ہمارے تمام امراض کی، بے توجہی ہی ہے کہ ہم کو تکمیل دین کی طرف توجہ نہیں۔

عقائد کا استحضار

اور چونکہ بحمداللہ عقائد تو ان لوگوں کے جو شہروں میں رہتے ہیں یا جو تعلیم یافتہ ہیں اور ان کو صلحاء کی صحبت میسر ہے کافی درجہ میں صحیح ہیں، اس لیے عقیدہ کے متعلق تو کسی جدید تعلیم کی ضرورت نہیں۔ البتہ مستحضر (۲) نہیں ہیں مگر ضرورت کے موقع پر ان کا استحضار (۳) بھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارا پروردگار کون ہے اور تم کس کی عبادت کرتے ہو تو وہی جواب میں کہیں گے جو حاصل ہے اس آیت کا۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ عقائد ذہن میں حاضر تو ہیں مگر دوسری چیزیں ذہن میں اس قدر غالب ہوگئی ہیں کہ وہ حاضر بھی مثل غائب کے ہوگیا۔

شاید کسی کو اس تقریر سے یہ خَلجان ہوا ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے اور پھر مثل غائب کے ہیں تو میں اس شبہ کے رفع کرنے کے لیے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ مثلاً موٹی بات ہے کہ خط لکھنے بیٹھئے تو کاغذ کا نظر آنا، روشنائی کا نظر آنا، قلم کا نظر آنا ضرور ہے مگر ان سب کے نظر آنے کے واسطے ضیا کی ضرورت ہے دن کو بھی اور رات کو بھی۔ دن کو آفتاب کی روشنی کی مدد سے ہر چیز نظر آتی ہے، رات کو لالٹین وغیرہ کی روشنی سے۔ غرض نورانیت کی ضرورت ہر حال میں ہے کہ بغیر اس کی استعانت (۴) کے خط نہیں لکھ سکتے اور لکھتے وقت جب کاغذ پر اور حروف پر نظر پڑتی ہے تو اس ضیا (۵) پر بھی ضرور پڑتی ہے بلکہ اول روشنی پر ہی نظر پڑتی ہے مگر سچ بتایئے کہ کبھی لکھنے کے وقت کسی کو بھی اس طرف توجہ ہوتی ہے کہ اول ہماری نظر ضیا پر پڑتی ہے عموماً کسی کو بھی اس پر التفات نہیں ہوتا۔

(۱) اہم کاموں کی طرف (۲) پیش نظر (۳) پیش نظر بھی ہوجاتے ہیں (۴) مدد (۵) روشنی۔

لیکن اگر کوئی لکھتے ہوئے آپ سے پوچھے کہ کیا اس وقت آفتاب نکل رہا ہے تو آپ بے ساختہ کہیں گے کہ ہاں نکل رہا ہے اور اس جواب میں ذرا تامل نہ کریں گے مگر باوجود اس کے بھی دوسری طرف کی توجہ نے اس توجہ الی الضیاء کو مستور ہی نہیں بلکہ معدوم (۱) کر دیا ہے۔ اب اس مثال سے آپ آسانی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ذہن میں موجود ہو اور پھر مثل غائب کے ہو۔

درجات عقائد

بس اسی طرح عقائد کے دو درجے ہیں۔ ایک تو مرتبہ تحقیق ورسوخ کا ہے اور ایک مرتبہ استحضار وتوجہ کا ہے جس کو دوسری عبارت میں یوں کہئے کہ ایک مرتبہ علم کا ہے اور دوسرا مرتبہ حال کا ہے۔ تو بحمداللہ مرتبہ تحقیق ورسوخ میں تو کمی نہیں ہے البتہ توجہ واستحضار میں کمی ہے حالانکہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے اس لیے میں آج توجہ کے متعلق بیان کرتا ہوں اس کا محل متعدد امور ہیں جن میں سے بعض کا بیان تو کر چکا ہوں اور بعض باقی ہیں اور وہ بعض باقی کلیات کے درجہ میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔ جزئیات میں ان سے خود کام لے لیا جائے گا اسلیے ان کلیات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہے مبہم تمہید۔

مفسر یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل امر یہ عبارت ہے اور یہی روح ہے اس آیت کی اور اس کے قبل اسی کی تمہید ہے اور اس کے بعد اسی کی تاکید ہے۔ چنانچہ بقدر ضرورت عرض کرتا ہوں۔

عبادت کی حقیقت

وہ روح یہ ہے فاعبدہ جس کا ترجمہ یہ ہے عبادت کیجئے۔ عبادت کا لفظ ہر مسلمان کے کان میں برابر پڑتا رہتا ہے اور اکثر اطلاق سے معنی بھی اس کے قریب قریب سب کو معلوم ہیں جس سے اس کے معنی ومفہوم کے متعلق تو بیان کرنا کوئی نئی بات

(۱) روشنی کی طرف توجہ کو پوشیدہ ہی نہیں بلکہ بالکل غائب کر دیا۔

نہ ہوگی البتہ کمی یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت ہمارے ذہن میں نہیں آتی اور اسی لیے اس کے حقوق کی طرف بھی توجہ نہیں۔ چنانچہ جب ہم اپنی حالت کا موازنہ کرتے ہیں تو بہت شرم آتی ہے کہ قرآن میں تو عبادت کے متعلق امر کا صیغہ ہے کہ جس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت ضروری ہے اور یہاں اس کا پتہ بھی نہیں۔ تو اگر حقیقت عبادت کی معلوم ہو تو ادھر توجہ بھی ہو۔ اس لیے اس کو بتلاتا ہوں اور بہت سہل عنوان سے بتلاتا ہوں۔

سو عبادت کا وہ سہل عنوان ہے عبد شدن یعنی غلام ہو جانا تو فاعبدہ کے معنی یہ ہوئے کہ غلام بن جاؤ۔ اب اس عنوان ہی پر نظر کر کے آپ اپنی حالت کو دیکھ لیجئے کہ آیا ہم نے غلامی اختیار کی ہے یا نہیں اور اختیار کی قید میں نے اس لیے لگائی کہ غلامی کی دو قسمیں ہیں ایک تو اضطراری وہ یہ کہ جس نے خریدا وہ مالک ہو گیا اور خریدشدہ غلام ہو گیا جس میں غلام کے اختیار کو اصلاً دخل نہیں۔ سو اس قسم کی غلامی تو غلام کا کوئی کمال نہیں، یہ تو ایجاب وقبول کے بعد بلا اس کے اختیار کے ہو ہی جائے گا۔

جیسے عورت پر طلاق کہ ادائے صیغ طلاق (۱) سے فوراً ہو جاوے گی، چاہے عورت چاہے یا نہ چاہے یا کوئی مرجاوے تو متروکہ وارث (۲) کی ملک میں ہو جاوے گا۔ خواہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے۔ ایک غلامی اختیاری ہے کہ اپنے قصد سے کسی کا منقاد و مطیع ہو جاوے (۳)۔ اسی کا نص میں (۴) امر ہے (۵) اور یہی کمال مطلوب ہے۔ یہ وجہ اختیار کے قید لگانے کی ہے اور اضطراری غلامی تو تمام مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہے جس سے نکلنا محال ہے اور اوپر جو اضطراری غلامی کو وقوع طلاق وثبوت ملک وارث کے ساتھ تشبیہ دی گئی اس پر کچھ مضمون ضروری طلاق ومیراث کے متعلق یاد آ گیا وہ بھی استطراداً (۶) عرض کیے دیتا ہوں۔

مسئلہ طلاق ومیراث

طلاق کے متعلق میرے پاس ایک استفتاء آیا تھا کہ ایک شخص نے اپنی عورت

(۱) طلاق کا لفظ منہ سے نکالتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی (۲) اس کے چھوڑے ہوئے مال کا وارث مالک ہو جائے گا (۳) فرمانبردار واطاعت گزار ہونا (۴) قرآن وحدیث (۵) حکم (۶) ضمناً بیان کرتا ہوں

کو طلاق دی۔ عورت نے کہا میں تو نہیں لیتی۔ سائل نے پوچھا تھا کہ اس صورت میں طلاق ہوئی یا نہیں۔ یہاں سے جواب گیا کہ طلاق ہوگئی۔ عورت کے نہ لینے سے کچھ نہیں ہوسکتا، اس کو تو جھک مار کے لینا پڑے گی اور نہ لے جب بھی پڑ جائے گی۔

گر نہ ستانی بہ ستم مے رسد(۱)

اب اگر کوئی عورت کہے کہ میری لیاقت اور شائستگی تھی کہ میں نے تمہاری خاطر سے طلاق کو قبول کرلیا تو کوئی عقلمند اس کا احسان مانے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص اس کی بات پر ہنسے گا کہ سبحان اللہ! یہ بڑا کمال کیا آپ نے۔ بھلا اس کے نہ قبول کرنے سے ہوتا کیا ہے۔ ذرا قبول نہ کرکے تو دیکھ لیجئے۔ مثلاً طلاق وانقضائے عدت (۲) کے بعد کے متعلق اگر عدالت میں نالش کرے (۳) اپنے نان ونفقہ کا تو عدالت خواہ رسمی ہو خواہ قانونی، خواہ عرفی ہو خواہ شرعی، یہی حکم کرے گی کہ چونکہ طلاق واقع ہوگئی اس لیے نان ونفقہ واجب نہیں رہا۔ جب نہ قبول کرنے کا کچھ اثر نہیں تو قبول میں کچھ کمال بھی نہیں، قبول کرنا اسی چیز کا کمال ہے جو نہ قبول کرنے سے رد ہوسکے۔

اسی طرح ملک اضطراری بھی کوئی کمال نہیں۔ چنانچہ میراث میں بھی یہی ہے کہ ملک اضطراراً ثابت ہوجاتی ہے جو رد سے بھی رد نہیں ہوتی۔ اگر ایک وارث یوں کہتا ہے کہ میں وارث نہیں بنتا جب بھی وہ وارث ہوتا ہے۔

بہنوں کے وراثت چھوڑنے کا حکم

یہاں اس مثال پر ایک تفریع بھی ہے جس کے متعلق بعض اہل علم بھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ کوئی خاص وارث اپنا حق نہیں لینا چاہتا مثلاً بہن عام طور پر اپنا حق نہیں لیتی اور اس کی بناء ابتداء تو ظلم سے ہوئی ہے مگر اب رسم عام ہوگئی کہ میراث میں سے حصہ لینا عورت کے لیے عیوب میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس واسطے وہ حصہ نہیں لیتی بلکہ یہ کہہ دیتی ہے کہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا حصہ بھائی لے لے

(۱) ''اگر نہیں لیتی تو زبردستی پہنچے گی'' (۲) عدت گزرنے کے بعد (۳) مقدمہ کرے۔

تو اس کے اس کہنے سے بھائی اس بہن کے حصہ کا مالک نہیں ہوتا کیونکہ اول تو جب اس رسم ورواج کی بناء ظلم پر ہے تو بہن نے طیب قلب سے اپنا حصہ نہیں چھوڑا اور بدون طیب قلب کے کسی کا مال دوسرے کے لیے حلال نہیں۔ دوسرے اگر فرض کیجئے کہ اس کہنے کی بناء ظلم بھی نہ ہو بلکہ طیب خاطر سے بھی کہہ دے تب بھی بوجہ اس کے اضطرار(۱) مالک ہوجانے کے وہ حصہ اس کی ملک ہوگیا اور ملک ہوجانے کے بعد کوئی عقد انتقال(۲) ملک کا پایا نہیں گیا۔ اس لیے وہ حصہ اس کی ملک سے خارج نہیں ہوا بلکہ وہ ترکہ میں سے اپنے حصہ کی بدستور مالک ہے۔

اب اس مسئلہ کے چند فروع ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس نے اپنی زندگی میں نہ لیا تو مرنے کے بعد بہن کی اولاد اس کا حصہ پاوے گی اور اگر ماموں سے لینا چاہیں تو شرعاً مطالبہ کرسکتے ہیں۔ اس میں غلطی کی بناء یہ ہوتی ہے کہ بہن کے اس کہنے کو کہ میں اپنا حصہ لینا نہیں چاہتی کافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کافی نہیں۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اچھا پھر کیا کہیں؟ کیا یوں کہہ دے کہ میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتی ہوں، سو یہ بھی کافی نہیں کیونکہ ابراء دیون(۳) سے ہوتا ہے اعیان سے نہیں ہوتا۔

یعنی اگر کسی کے ذمہ میرے دس روپے آتے تھے اور میں نے کہا کہ میں نے یہ روپیہ معاف کردیا تو میرے اس کہنے سے قرض اس کے ذمہ سے ساقط ہوگیا۔ یہ تو ہے جرأت عن الدین(۴) اور اگر میرا قلمدان رکھا ہے میں نے کہا جاؤ میں نے تمہیں یہ قلمدان معاف کردیا تو اس کے کہنے سے نہ وہ میرے ملک سے خارج ہوا نہ آپ کی ملک میں داخل ہوا۔ وہاں ''وھبت نحلت اعطیت''(۵) یا اور انہیں کے ہم معنی الفاظ کی ضرورت ہوگی۔

اسی طرح تمام شرائط ہبہ کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ اس واسطے بہن کے معاف

(۱) بلا اختیار مالک ہونے کی وجہ سے (۲) ملک منتقل کرنے کا کوئی معاملہ (۳) دست برداری قرض سے ہوتی ہے جو چیز کسی کی ملک میں ہو اس کو یوں کہنا کہ میں نے معاف کیا اس سے ملک تبدیل نہیں ہوتی (۴) قرض سے بری کرنا (۵) ''میں نے ہبہ کیا یا بخشش کیا یا عطا کیا''۔

کر دینے سے وہ حق وراثت معاف نہیں ہوا اور نہ بھائی کی ملک میں داخل ہوا کیونکہ وہ حصہ حصہ عین ہے دین نہیں ہے(۱)۔ اگر اس کے واقعی دینے کی نیت ہو تو اس کو الفاظ ہبہ کے ساتھ ہبہ کرنا چاہیے یا بیع کرنا چاہیے اور جو کچھ کرے اس کی شرائط پوری ادا کرنا چاہئیں۔

بھائی کو وراثت ہبہ کرنے کی شرائط

مثلاً اگر ہبہ کرے تو مسئلہ یہ ہے کہ قبل تقسیم کے ہبہ صحیح نہیں۔ مثلاً ایک جائیداد قابل تقسیم ہے اور اس میں بہن کا حصہ ہے اور بہن نے تقسیم سے پہلے ہبہ کیا تو یہ ہبہ جائز نہیں اور اگر تقسیم کے بعد ہبہ ہوا ہے تو بشرط قبض صحیح ہے غرض ہبہ صرف کاغذی نہیں ہونا چاہئے حسی وحقیقی ہونا چاہیے۔ کاغذ تو محض تکمیل ہبہ کی سند اور حکایت ہے(۲) جس سے پہلے محکی عنہ(۳) کا وجود ضروری ہے۔ محض کاغذی کاروائی پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مہاجن تھا، نہایت محاسب مگر عقل سے کورا۔ وہ اپنے کنبہ کو ساتھ لے کر بہلی میں سوار ہو کر کہیں سفر کو نکلا۔ راستہ میں ایک ندی پڑی۔ بہلی بان سے کہا ٹھہر جاؤ میں ذرا حساب لگالوں کہ پانی کتنا ہے۔ بانس لے کر پانی میں اترا اور جا بجا پانی کو بانس سے ناپ لیا کہ یہاں ایک ہاتھ ہے آگے دو ہاتھ ہے، آگے چوتھائی بانس ہے اس سے آگے آدھا اور پھر ایک بانس ہے۔ سو بعض جگہ ڈوباؤ کی مقدار بھی تھا مگر اس نے اس سرے سے اس سرے تک سب ناپ کر حساب کر کے اوسط نکالا کہ کمر تک ہے تو بہلی کیوں ڈوبنے لگی، بہلی بان(۴) سے کہا چل۔ وہ چلا آگے جا کے بہلی لگی ڈولنے تو آپ نے پھر اپنا حساب جانچا کہ کہیں غلطی تو نہیں ہوگئی، حساب بالکل ٹھیک تھا تو آپ کہتے ہیں لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں؟

میں نے اس واسطے یہ قصہ سنایا کہ خود قانون دان بھی اس کاغذی تقسیم کو حقیقی تقسیم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شرعاً جو تقسیم مطلوب ہے وہ کاغذی نہیں کہ سہام قائم کر دے جس

(۱) بذاتہ اس کی ملک ہے بھائی کے ذمہ قرض نہیں (۲) بیان ہے (۳) اس بیان سے پہلے وہ ہبہ وقوع پذیر تو ہو (۴) بیل گاڑی والے سے۔

کی حد بندی ہونا چاہیے۔ یہ تو ہبہ کے لیے شرط ہے۔

ایک شرط دیانتاً بھی ہے وہ یہ کہ خوش دلی اور طیب خاطر سے ہونا چاہیے۔ اگر خوش نہیں تو ہبہ ملک تو ہوجاوے گی ملک خبیث رہے گی۔ فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا (۱) یہ آیت زوجین کے بارے میں اور ظاہر ہے کہ میاں بیوی میں جتنی بے تکلفی ہوتی ہے اتنی بھائی بہن میں نہیں ہوتی مگر دیکھئے کہ میاں بیوی کے بارے میں یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر وہ مہر معاف کردیں طیب خاطر سے تو کھاؤ ورنہ نہیں۔ بس جہاں اتنی بے تکلفی بھی نہیں وہاں کیونکر طیب خاطر کا لحاظ ضروری نہ ہوگا۔ نیز حدیث شریف میں ہے: لایحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منه (۲)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ بہن جو دیتی ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیتی بلکہ بدنامی کے خوف سے دیتی ہے اس لیے یہ ہبہ عنداللہ صحیح نہیں ہوا۔ باقی یہ کہ خوش دلی کیونکر معلوم ہو اس کی صورت یہ ہے کہ جائیداد تقسیم کرکے بہن کو اس کے حصہ پر قبضہ کرادو اور دو تین سال تک اسے جائیداد کی آمدنی سے منتفع (۳) ہونے دو کہ اسے جائیداد کا حظ (۴) تو آجائے اور معلوم ہوجائے کہ زمینداری کیا چیز ہے اور روپیہ کیا چیز ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کتنی بہنیں حصہ دیتی ہیں۔ اس طیب خاطر پر ایک اور فرع بھی متفرع ہوتی ہے۔

چندہ کی رسم

وہ یہ کہ آج کل چندہ کی عام رسم ہے اور اس کی کچھ پروا نہیں کی جاتی کہ دینے والا جبر وکراہت سے دیتا ہے یا کہ طوع ورغبت سے (۵)۔ عام حالت یہ ہے کہ قصداً جبر وکراہت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے اس لیے کسی صاحب اثر وذی وجاہت کو چندہ وصول کرنے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے خواہ وجاہت دینیہ ہو جیسے علماء اور مشائخ اور خواہ دنیویہ جیسے عہدیدار، امراء اب غور کرنے کی بات ہے۔ یہ چندہ حلال ہوا یا نہیں؟ اس

(۱) ''ہاں اگر وہ بیویاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو ان مہر کا کوئی جزو تو تم خوش دلی سے کھاؤ اس کی صریح دلیل ہے'' سورۃ النسآء: ۴ (۲) ''کسی شخص کا مال بغیر اس کی دلی رضا مندی کے حلال نہیں'' کتاب التمہید ین لابن عبدالبر ۱۰/۲۳۱ (۳) فائدہ اٹھانے دو (۴) لطف (۵) خوش دلی اور شوق سے۔

لیے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فتویٰ کافی ہے۔ لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ(۱)

چندہ وصول کرنے والوں کے عذر کا جواب

اس کے متعلق دو عذر کیے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ صاحب ہم نے جبر کہاں کیا، کوئی تلوار تھوڑا ہی اس کے گلے پر رکھی تھی کہ ہمیں زبردستی دو، ہم نے تو سب سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ خوش ہو دو ورنہ مت دو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کا یہ کہنا تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپ کہیں دعوت میں جہاں صرف آپ کو بلایا گیا تھا اپنے بچوں کو بھی ہمراہ لے جائیں اور وہاں پہنچ کر صاحب خانہ سے کہیں کہ صاحب خوشی ہو تو یہ بھی دستر خوان پر بیٹھیں ورنہ نہیں۔ اب بتلائیں وہ کیا کہے گا۔ زبان سے تو بے شک کہہ دے گا کہ اس پوچھنے کی کیا ضرورت ہے لیکن دل میں وہ کیا کہتا ہوگا اس کو خود سوچ لیجئے۔ اگر کوئی آپ کے یہاں ایسا کرے تو آپ دل میں خود کہیں گے کہ یا اللہ یہ فوج کی فوج کہاں سے آ گئی مگر زبان سے یہی کہیں گے کہ ہاں صاحب ضرور بیٹھیں، تشریف لائیے، سب آپ ہی کا تو ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ خوشی ہے یا صرف الفاظ ہیں۔ خوشی کے، یقیناً خوشی سے نہیں کہا جاتا مگر زبردستی کوئی سر پر آ پڑے تو غریب کیا کرے۔ کیا تہذیب کو چھوڑ کر صاف کہہ دے کہ یہ نہ بیٹھیں، ایسی ہمت ہر ایک کو نہیں ہوتی، ہاں بعضے صاف بھی کہہ دیتے ہیں جیسے ایک شخص نے نماز کی نیت میں صفائی کی تھی۔

زبردستی کی نماز

ساڈھورہ میں ایک واعظ آئے تھے۔ وہ لوگوں کو لٹھ مار مار کر نماز پڑھاتے تھے، ایک بوڑھے شخص کو زبردستی مسجد میں نماز کے لیے لائے۔ وہ بے چارہ کھڑا ہوا اور نماز کی نیت کہلوائی تو آپ نے اس طرح نیت کی کہ نیت کرتا ہوں میں چار رکعت عصر کی، منہ میرا طرف کعبہ شریف کے پیچھے اس امام کے، ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ اکبر!

(۱) ”یعنی کسی شخص کا مال اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خوش دلی نہ ہو“ کتاب التمہید لابن عبدالبر: ۱۰/۲۳۱

بے چارہ صاف دل تھا خدا کو دھوکہ نہیں دیا۔ اگرچہ ظلم ہی سے پڑھی مگر پڑھی تو اور پھر صاف کہہ بھی دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا، اس کو چھپایا نہیں، اس شعر کا عامل تھا۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بہ درودے (۱)

اس بے چارہ نے جیسی پڑھی تھی زبان سے بھی صاف کہہ دیا کہ اس کی نماز ہماری ریا کی نماز سے تو اچھی تھی کہ ہم ظاہر میں خدا کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور نیت دوسروں کو دکھانے کی ہے اور پھر اس کو چھپاتے ہیں۔ اسی کی نسبت فرماتے ہیں:

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم　　چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی (۲)

حقیقت میں اس تقدس ریائی سے تو رنڈی اچھی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ رنڈوں کو تقدس کی ضرورت نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اہل تقدس کو ریا سے بچنے کی ضرورت ہے اور رنڈوں کو تقدس کی ضرورت۔ نہ یہ کہ عابد تو عبادت چھوڑ دے اور رنڈی پر قائم رہے بلکہ گفتگو صرف یہ ہے کہ ان دونوں میں کون اچھا ہے تو وہی اچھا جس سے لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔

گناہ آمرز زندان قدح خوار　　بہ طاعت گیر پیران ریاکار (۳)

تو جب اس غریب نے زبان سے کہہ دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور واقع میں تھا بھی ایسا ہی تو اس نے دھوکہ تو نہیں دیا۔ مگر ایسے صاف گو اب کہاں جو چندہ میں زبان سے کہہ دیں کہ تمہارے ظلم سے دے رہا ہوں بلکہ غالب یہ ہے کہ زبان سے خوشی ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کراہت ہوتی ہے۔ تو یہ چندہ بھی حلال نہیں ہوگا۔

قبولِ دعوت میں بے احتیاطی

اب تو دعوتوں میں بھی ایک کی جگہ دو کے آنے سے گرانی ہوتی ہے کیونکہ اب پہلے کی سی ارزانی (۴) نہیں رہی اور ممکن ہے یہاں پر کسی کو گراں نہ ہوتا کیونکہ حق تعالیٰ نے

(۱) ''تم ان لوگوں میں سے ہرگز مت ہو جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں'' (۲) ''میں قمار خانہ گیا وہاں تمام لوگوں کو اصول کا پابند پایا اور جب میں عبادت خانہ پہنچا وہاں لوگوں کو نظم وضبط کا پابند نہ دیکھا'' (۳) ''خدا شرابی رنڈوں کے گناہ بخشنے والا، ریاکار عبادت گزاروں کو پکڑنے والا ہے'' (۴) سستائی۔

یہاں لوگوں کو ثروت دی ہے مگر جب ثروت سے زیادہ بار ہونے لگے تو سب ہی کو گرانی ہوگی۔ مثلاً پچاس آدمیوں کی دعوت تھی اور دوسو آگئے تو داعی میں ثروت تو ہے کہ بازار سے منگا کر کھلا دیں گے مگر لوگوں کی نظر میں کر کری تو ہوجاوے گی کہ ان کے گھر میں کھانا نہیں تھا تو اس سے بھی بار ہوسکتا ہے اس لیے اپنے بچوں کو ساتھ لے جا کر صاحب خانہ سے پوچھنا کافی نہیں بلکہ لے جانا ہی نہ چاہیے۔ اس مقام پر شاید کوئی اس پوچھنے کی کفایت پر اس حدیث سے استدلال کرنے لگے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی تھی اور ایک شخص راستہ سے آپ کے ساتھ ہوگیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں پہنچے تو آپ نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ بھئی تمہاری خوش ہو تو یہ شخص آوے ورنہ نہیں، صاحب خانہ نے کہا کہ خوشی ہے کہ آوے۔

صحابہؓ کی بے تکلفی

میں کہتا ہوں بس آپ نے ایک حدیث پر نظر کی دوسری حدیث پر نظر نہیں کی۔ وہ یہ کہ ایک شخص فارس کا رہنے والا شوربا اچھا پکاتا تھا۔ ایک روز اس کا جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کھلا دے۔ چنانچہ حاضر ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے چلئے تھوڑا شوربا نوش فرمالیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہؓ بھی چلیں گی، اس وقت تک حجاب نازل نہ ہوا تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہماری کوئی دعوت کرے اور ہم قبول دعوت میں کوئی شرط لگالیں تو اس بناء پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھئی ہمارا ایک مہمان بھی ہے اور جیسے ہم کو شرط لگانے کا اختیار ہے اسی طرح داعی کو بھی اختیار ہے خواہ وہ ہماری شرط کو منظور کرے یا نہ کرے اس صورت میں جبر نہیں ہے اس لیے یہ جائز ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عائشہؓ بھی۔ گو اس شخص کا پہلے سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دعوت کا ارادہ نہ تھا مگر اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانے سے وہ ارادہ کرسکتا تھا۔ مگر اس نے اپنے ارادہ کو چھپایا نہیں۔ صاف کہہ دیا کہ نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دعوت نہیں۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کا اندازہ کیجئے کہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں آزادی کی تعلیم اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں عائشہؓ بھی اور وہ کہتا ہے نہیں عائشہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو اتنا آزاد بنایا تھا کہ وہ جان دینے کو ہر وقت تیار مگر کھانا دینے کو ہر وقت تیار نہیں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جاں نثاری کی تو یہ حالت تھی جیسا کہ ایک صحابی فرماتے ہیں:

فان ابی و والدتی وعرضی　　لعرض محمد منکم وقاء(۱)

مگر اس کے ساتھ ہی وہ امور اختیاریہ میں بے تکلف بھی اس درجہ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دعوت کو شرط بناتے ہیں وہ نہیں مانتا۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ عائشہؓ نہیں تو ہم بھی نہیں۔ اس نے کہا نہ سہی اور چل دیا۔

آج تو کوئی مرید اپنے پیر کے ساتھ ایسا کرے، دیکھئے پھر کیا ہوتا ہے، بجائے مرید کے اس کا لقب مرتد ہوجائے گا مگر اس سے تو اس کی اور ترقی ہوگئی کہ نیچے کے دو نقطے اوپر آگئے اور پھر دال بھی مشدد ہے کیونکہ دو دال ہیں۔ ایک کا دوسرے میں ادغام ہوگیا۔ مرید کے تو چار ہی حرف تھے اور یہاں پانچ حرف ہوگئے۔ گو حساب ابجد میں پانچ حرف نہیں مانے جائیں گے کیونکہ اس کا قاعدہ اور ہے۔ وہاں ملفوظی کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ مکتوبی کو دیکھا جاتا ہے۔ غرض یہ تو اور احسان ہوا پیر کا کہ مرید کی ترقی کردی مگر میں مرشد کو مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے مرید کو مرتد تو نہ کہو بلکہ ایسا ہی غصہ نکالنا چاہو تو مرید ہی کہہ لو ''بفتح المیم'' کہ پہلے تو میم کو رفع تھا(۲) جو رفعت کی علامت تھی اور اب نصب ہوگیا مشقت کے معنی میں ہے۔

غرض آج کل کوئی ایسا معاملہ کرے تو مرشد صاحب اس کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول کریں مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ کس کا حق ہوگا۔ ہمیں تو اپنے واسطے آپ کو نمونہ بنانا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص پھر لوٹا کہ حضور تھوڑا سا شوربا نوش فرمالیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اور عائشہؓ بھی، اس نے پھر یہی کہا کہ نہیں عائشہؓ نہیں۔

حقیقت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے غلاموں کو کس قدر بے تکلف بنادیا تھا۔

(۱) ''میرا باپ اور میری ماں آبرو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لیے وقایہ ہیں'' (۲) میم پر پیش تھا۔

میں مرشدوں اور استادوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو ایسا ہی بے تکلف رکھو مگر نوکروں کو نہیں کیونکہ اگر اسے گستاخ کرلیا تو وہ آقا کو پریشان کرے گا مگر اتنا ذلیل بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جیسا آج کل کیا جاتا ہے کہ بارہ پہر باہر رہو(۱)، جب گھنٹی بجادیں تب آؤ۔ یہ صاف کبر ہے اور نہایت بری بات ہے۔ ممکن ہے کہ کسی وقت وہ ہماری جگہ ہوجاوے تو سوچ لیجئے کہ آپ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے تو آپ کو کس قدر ناگوار ہو۔ شاید تم یہ کہو کہ ایسا ہونا تو بعید ہے۔ اجی اتنا سا انقلاب خدا کو کیا مشکل ہے۔ جب سلطنتیں بدل جاتی ہیں تو ایک غریب کا امیر ہوجانا اور ایک امیر کا غریب ہوجانا کیا بعید ہے۔ چنانچہ اس قسم کی بہت حکایتیں ہیں۔

حکایت

ان میں سے ایک حکایت بہت مشہور ہے کہ جو بوستان میں لکھی ہے۔ ایک تونگر(۲) کے یہاں ایک فقیر آیا۔ اس نے سوال کیا، اسے نکال دیا، پھر اتفاق سے تونگر پر افلاس(۲) آگیا اور ایسی مصیبت پڑی کہ بیوی تک کو طلاق دینا پڑی اور اب بھیک کی نوبت پہنچ گئی۔ اتفاق سے یہ کسی جگہ پہنچا وہاں جاکر سوال کیا، صاحب خانہ نے اپنی عورت سے کہا کہ سائل کو کچھ دے آؤ، عورت نے جو سائل کو دیکھا تو زاروقطار رونے لگی۔ اس نے رونے کا سبب پوچھا، تو اس نے کہا کہ یہ میرا پہلا شوہر تھا، ایک مرتبہ ہم میاں بی بی بیٹھے تھے کہ ایک سائل آیا، اس کو اس نے بہت سختی سے جھڑک دیا، اسی کے وبال میں یہ گرفتار ہوا، اس نے کہا وہ سائل میں ہی تھا۔

دیکھئے کیسا انقلاب ہوا کہ سائل مسؤل ہوگیا اور مسؤل سائل اور پھر دولت تو دولت بیوی تک اس کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ خدا کی قدرت ہے اور اگر دنیا میں ایسا نہ بھی ہوا تو کیا آخرت میں بھی کچھ نہ ہوگا۔

غرض نوکر کی نہ اتنی تحقیر کرو جو خدا کو بری لگے اور نہ اس سے اتنی بے تکلفی کرو

(۱) سارا دن (۲) مال دار کے گھر (۳) مال دار غریب ہوگیا۔

کہ گستاخ ہوجائے۔ بہر حال گستاخ تو نہ کیجئے مگر شفقت کے ساتھ رکھئے۔ غرض اعتدال کی رعایت ضروری ہے۔

میرے ایک دوست ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہ اپنے نوکر کو کھانا تک ساتھ کھلاتے تھے۔ میں نے انہیں اس سے منع کیا، انہوں نے نہ مانا، آخر میں اس کی گستاخی اتنی بڑھ گئی کہ انہیں علیحدہ کرنا پڑا۔ اسی طرح مرید اور شاگرد کو پیر اور استاد تو مثل اولاد کے سمجھے اور مرید اور شاگرد اپنے کو غلام سمجھے۔ بہر حال ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سبق لینا چاہیے۔

وہ شخص پھر تیسری بار آیا کہ چل کے تھوڑا سا شوربا نوش فرمالیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا کہ عائشہؓ بھی، اس نے کہا اچھا عائشہؓ بھی، پھر دونوں حضرات تشریف لے گئے۔

شاید اس پر کسی کو شبہ جبر کا ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تو اس شخص کے یہاں بلاطیب خاطر کھایا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی رائے بدل گئی۔ پہلے یہ خیال تھا کہ شوربا ہے ایک آدمی بھر کا اور اس کا یہ جی چاہتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیر ہوکر کھاویں مگر اس نے جب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی آدھا پیٹ کھانا چاہتے ہیں تو میرا کیا بگڑتا ہے۔ تو اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے کراہت نہیں رہی۔

پس اس حدیث کو پہلی حدیث کے ساتھ ملا کر دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو گھر پر جا کر صحابی سے پوچھا کہ اگر اجازت دو تو یہ آئے ورنہ نہیں۔ یہ کس صورت اور کس حالت میں تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت پوچھا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو اپنے ساتھ اتنا بے تکلف بنا دیا تھا کہ اجنبی تو اجنبی وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے باب میں بھی صاف صاف عرض کر سکتے تھے۔ اب بتائیے کہ آپ نے بھی اپنے دوستوں کو اتنا بے تکلف کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اتنا بے تکلف کر رکھا تھا کہ میزبان کو یقین تھا کہ وہ اگر اجازت بھی نہ دے گا تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ویسے ہی بشاش رہیں گے جیسے اجازت کے بعد ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اتنی رعایت فرماتے تھے کہ کسی کو تنگ دلی نہ ہو۔

جبری چندہ

تو ہم کو کیا حق ہے کہ کسی پر جبر کر کے چندہ لیں چاہے اس کا دل چاہے یا نہ چاہے۔ محققین نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی سائل قرائن سے جانتا ہے کہ اگر کسی سے مجمع میں سوال کرے گا تو وہ ایک روپیہ دے گا اور اگر یہی سائل تنہائی میں سوال کرتا تو وہ آٹھ آنے دیتا اس صورت میں سائل کو آٹھ آنے سے زیادہ حلال نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجمع کا لحاظ ہوتا ہے اور شرم ہوتی ہے اس لیے ایسی حالت میں مجمع میں مانگنا بھی جائز نہیں تو حضرت جبر تلوار دکھانے کو نہیں کہتے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جسم کو اذیت پہنچا کر لینا حرام ہے۔ اسی طرح قلب کو اذیت پہنچا کر اور بوجھ ڈال کر لینا بھی حرام ہے بلکہ دل تو بدن سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اس واسطے چندوں میں اہل وجاہت کو درمیان میں نہ ڈالیں بلکہ خود تحریک کریں اور تحریک بھی عام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ فہرست لے کے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے دس روپے لکھے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی شان تو پچاس روپے کے قابل ہے۔ اس نے شرما شرمی بیس روپے کر دیئے، ایک عذر کا جواب تو یہ تھا جو خوشی ہو دو نہ ہو نہ دو۔ اس تقریر سے اس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔

دوسرا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ہم کچھ اپنے واسطے تھوڑا ہی کرتے ہیں، ہم تو اللہ کے واسطے کرتے ہیں تو اگر جبر بھی ہو تو کیا ہے۔ یہ عجیب عذر ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے واسطے جبر جائز ہے۔ بتلایئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہا ہے کہ میرے لیے ڈکیتی کرو۔ اگر یہی مسئلہ ہے تو آج تو یوں چندہ وصول کیا، کل چوری بھی کرو گے اور کہہ دو گے کہ اپنے واسطے تھوڑی کی ہے ہم نے تو مسجد کے لیے کی ہے اور عدالت میں بھی جا کر یہی عذر کر دینا۔ دیکھیں عدالت کیسے چھوڑ دے گی۔

اسی طرح عدالت عالیہ کو سمجھئے بلکہ غور کیا جاوے تو اس میں ایک اور باریک بات ہے وہ یہ کہ اگر نفس کے واسطے جبر کرتے تو اتنا برا نہ ہوتا جتنا اللہ کے واسطے کرنا برا

ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس کام کی غرض نہ حاصل ہو وہ بے کار ہوتا ہے۔

اب سوچو کہ اگر نفس کے واسطے کسی سے وصول کرتے اور غرض یہ ہوتی کہ تم کو دنیا کا نفع ہو تو جبر کی صورت میں یہ مقصود تو حاصل ہو جاتا اور اگر خدا کے واسطے جبر کیا جس میں غرض یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ خوش ہوں تو اس میں تو وہ مقصود بھی حاصل نہیں ہوا بلکہ جبر سے اُلٹا گناہ ہوا تو زیادہ برا ہوا۔

غرض اپنے نفس کے لیے جبر کرتے تو کچھ فائدہ تو حاصل ہوتا کہ روپیہ جیب میں آتا اور خدا کے واسطے ناجائز طریقہ سے روپیہ حاصل کیا تو خدا تعالیٰ بھی ناراض ہوئے اور کیا تھا خوش کرنے کو، اب تو یہ فعل محض لغو اور بیہودہ (۱) ہوا۔ تو یہ دوسرا عذر تو بالکل عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہو گیا۔ یہ تو ایسا ہو گیا جیسے ایک شخص نے ایک آدمی کو طمانچہ لگایا۔ وہ ناراض ہوا تو آپ کہتے ہیں معاف کیجئے۔ میں آپ کے ابا جان کو سمجھا تھا، سبحان اللہ! یہ عذر بڑا اچھا ہوا۔ تو یہ کہنا کہ ہم دین کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے واسطے نہیں کرتے، ایسا ہی عذر گناہ بدتر از گناہ ہوا تو خدا کے واسطے کام کرنے میں تو اور زیادہ احتیاط چاہیے۔ بہرحال ایسے ہی چندہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لا یحل مال امرائ مسلم الا بطیب نفس منہ (۲)۔

آج کل کے مجتہدین

یہاں ایک شبہ نئے مجتہدوں کی طرف سے اور بھی ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم قید لگائی ہے تو کافر کا مال جبراً لینے میں کیا حرج ہے کیونکہ آج کل مجتہد کثرت سے ہونے لگے ہیں۔ پہلے جب کوئی علوم میں امام ابوحنیفہ کے درجہ میں پہنچتا تھا جب مجتہد ہوتا تھا اور آج کل بس ترجمہ قرآن دیکھ لیا اور مجتہد ہو گئے اور پھر غضب تو یہ ہے کہ کافر بھی ہمارے مذہب میں اجتہاد کرنے لگے۔

چنانچہ میں ایک مقام پر ایک صاحب کے یہاں دعوت کی تقریب سے بلایا

(۱) بے کار اور ناپسندیدہ (۲) ''کسی مسلمان مرد کا مال بغیر اس کی دلی رضامندی کے حلال نہیں'' کتاب التمہید لابن عبدالبر: ۱۰/ ۲۳۱

ہوا گیا، وہ ملے نہیں، نوکر سے پوچھا کہاں گئے ہیں، کہا کھیلنے گئے ہیں، میں حیران ہوا کہ وہ کیا بچے ہیں جو کھیلنے گئے ہیں، ارے ظالمو! اس کا نام تفریح ہی رکھ دیا جاتا کیونکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کی بھی شائستگی سکھلائی ہے۔

چنانچہ جی متلانے کے معنی میں اہل عرب خبثت کہا کرتے تھے جس کا ترجمہ میرا جی میلا ہورہا ہے یا خراب ہورہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ یہ نہ کہو بلکہ یوں کہو ''نفست نفسی'' جس کا ترجمہ ہے میرا جی متلاتا ہے کیونکہ خبثت نفسی میں خبث کی اسناد ہے اپنے نفس کی طرف جو سننے سے برا معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے ہم تو اس کھیل کے لفظ پر بھی ضرور مواخذہ کریں گے جس سے آپ بچپن میں داخل ہونا چاہتے ہیں حالانکہ پہنچ چکے ہیں پچپن میں۔

میں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا، وہاں ایک انگریز بھی ان سے ملنے آیا تھا، وہ بھی اسی جلسہ میں بیٹھ گیا، اس نے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کیں، کہنے لگا کُرآن (قرآن) میں آیا ہے کہ طاعون ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اے اللہ! قرآن کی کونسی آیت میں یہ مضمون ہے، اتنے میں آپ نے خود ہی تفسیر کی دیکھو کُرآن (قرآن) میں آیا ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں مت جاؤ اور وہاں سے بھی مت جاؤ۔ اول تو اس ظالم نے حدیث کو قرآن بنایا، پھر اس میں اپنا اجتہاد ٹھونسا اور دوسرے جزو سے اس طرح استدلال کیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے دوسری جگہ جانے کو اس لیے منع فرمایا ہے کہ دوسری جگہ جاکے طاعون پھیلاؤ گے۔ سبحان اللہ! اس کو نص کا مدلول بتاتے ہیں، غرض اجتہاد اتنا عام ہوگیا ہے کہ کافر بھی ہمارے دین میں اجتہاد کرنے لگے۔

چنانچہ آج کل گاندھی بھی مسلمانوں کے مذہب میں مجتہد سمجھے گئے ہیں اور یہ ایسے مجتہد مصیب مطلق ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ سے تو اجتہاد میں غلطی بھی ہوتی تھی چنانچہ اسی بنا پر بعض مسائل میں ان سے رجوع ثابت ہے یا خود علمائے احناف نے ان کے بعض

فتووں کو چھوڑ کر صاحبین کے قول پر عمل کرلیا ہے مگر گاندھی کی زبان سے کوئی غلط بات نکلتی ہی نہیں، بس جو بات اس کے منہ سے نکلی نعوذ باللہ! گویا قرآن وحدیث ہاتھ باندھے اس کی تائید کو کھڑے ہیں کہ مولویوں نے فوراً اس کو شریعت سے ثابت کردیا۔ خدا خیر کرے۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیهدیهم طریق الهالکینا

اگر ایسے ہی مجتہد ہوئے تو وہ ضرور قوم کو تباہ کریں گے اور کر ہی دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آج کل اجتہاد کا زور ہے۔ حتٰی کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں، خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا۔

مسلم وغیر مسلم کے مال کا فرق

تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدوں طیب قلب (۱) کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے اور پھر شاید استدلال سے منتفع ہوکر (۲) ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی نہیں ہے اور غیر مسلم اس کے مالک ہیں، خواہ ان کے پاس ٹھیکہ ہے اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مگر بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ حرج نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہے۔

اس کا ایک جواب ظاہر تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال حلال نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث وعید میں ''الرجل یقتطع مال الرجل'' (۳) آیا ہے۔ رواہ فی الترغیب عن الحاکم وقال صحیح علی شرطهما۔

(۱) بغیر خوش دلی (۲) اس استدلال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (۳) ایک آدمی دوسرے آدمی کا مال لے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر ذمی اور کافر مستامن (۲) حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے۔ ''لھم مالناو علیھم ماعلینا'' (۳) البتہ کافر محارب (۴) کا مال مباح ہے مگر وہاں بھی فریب اور عذر جائز نہیں۔

مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔ چنانچہ مولانا نے فریا کہ بھئی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جاویں گی تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا۔ خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر، پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا۔

اگر کوئی کہے کہ پھر اسے نفع کیا ہوا جب نیکیاں اس کے کار آمد نہ ہوئیں۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا۔ جیسے اگر کسی کے پاس من بھر سونے کا ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھی سونا چرالیا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی لیکن اسے کوئی عادل اور کوئی عاقل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا چرالیا کرو۔

مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہ ہو اور کوئی یہ کہہ کر ملادے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا تو کیا یہ جرم نہیں، یقیناً جرم ہے۔ اگر اطلاع ہوجائے تو ضرور سزا ہوگی مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے مگر عدم احساس سے بطلان شے تو لازم نہیں آتا۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزا میں کچھ تخفیف ہوگئی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا۔ اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی۔ گو اس خفت کا احساس نہ ہو۔

---

(۲) ایسا کافر جو جذبہ دیگر با امن لیکر رہتا ہو (۳) ''ان کے لیے وہ ہے جو ہمارے لیے ہے اور جو ان پر ہے وہ ہم پر بھی ہے (۴) وہ کافر جس سے لڑائی ہو رہی ہو۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے ’’لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ‘‘ کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی۔ یہ تعارض ہوا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو۔ باقی یہ مطلب اس آیت کا نہیں ہے کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمالِ مراتب میں تفاوت ہے کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں اور بعضے ایسے نہیں، اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں۔ یہ نہیں کہ فرعون اور شداد و نمرود کے برابر اس کافر کو بھی عذاب ہو جو غریب مسکین مظلوم تھا۔ تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں۔ اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا دوسرے کو اس کا ضعف (۱) ہوگا اور کسی کو ضعفین (۲) اور یہ سب قرآن میں آیا ہے۔ البتہ جس کے لیے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائے گا عذاب مجوز میں خفت کی نفی ہے۔

بہر حال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔ اب تیسرا جواب سنئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی عادل اُمت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہنچائے گا۔ اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلوتراشی کرے گا کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ

خانہ دوستاں بروب ودر دشمنان مکوب (۳)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کو اس سے بھی روک دیا جس سے اب خانہ دوستاں بروب (دوستوں کے گھر مت جھاڑ) کی بھی گنجائش نہ رہی۔ اس کی اس لیے تصریح کر دی کہ شاید اس قول کے ظاہر پر عمل کرنے لگے مگر ایسے شخص کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ دوست بھی اس عمل پر کرے اور جو کچھ آپ اس کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لے جائے تو کیا آپ کو گوارہ ہوگا۔ اگر گوارہ نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے۔ اور شیخ کے کلام میں رفتن کا وہ درجہ مراد ہے جس کو گوارہ کیا

(۱) اس کا ڈبل (۲) کسی کو ڈبل سے بھی ڈبل (۳) ’’دوستوں کا گھر جھاڑ، دشمنوں کا دروازہ مت کھٹکھٹا‘‘

جاسکے جیسے بعضی صورتیں دوستوں میں بے تکلفی کی ہوتی ہیں۔

تقسیم وراثت میں احتیاط

غرض اس پر کلام بڑھ گیا تھا کہ بدون طیب خاطر کے کسی کا مال حلال نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہنوں کا حصہ بھی حلال نہیں کیونکہ عموما طیب خاطر سے وہ نہیں دیتیں، محض رسم ورواج سے دیتی ہیں۔ اس میں صحت ہبہ کے لیے دیانت کا بھی حکم ہے کہ ان کے قبضہ میں رقم اور جائیداد جانے کے بعد اور اس کی آمدنی وصول کرنے اور خرچ کرنے کے بعد اگر وہ دیں تو ہبہ صحیح ہے ورنہ نہیں اور قضاء کا حکم یہ ہے کہ وہ ہبہ کردے حسب شرائط یا بیع کردے۔ محض معاف کردینے یا دستبردار ہونے سے اس کی ملک زائل نہیں ہوتی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ زبانی بیع کرالیجئے اور اختیار ہے کہ اگر دس لاکھ کا بھی حصہ ہے اور وہ دس روپے میں بیچ دے تو معاملہ درست ہوجائے گا اور پھر کہہ دے کہ میں نے زرثمن معاف کردیا کیونکہ بیع میں غیر مشاع ہونا ضروری نہیں۔

یہ سب کلام ملک اضطراری پر چلا تھا اور اصل مضمون یہ تھا کہ ایک درجہ تو ہماری غلامی کا یہ ہے کہ ہم بطور ملک اضطراری خدا کے غلام ہیں۔ سو یہ تو ہماری کوئی خوبی نہیں۔

اختیاری غلامی

خوبی یہ ہے کہ ہم خود چاہیں غلام بننا۔ جیسا آسمان وزمین سے کہا گیا تھا'' فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ''(۱) اور انہوں نے عرض کیا'' قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ''یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین وآسمان سے کہا کہ ہماری اطاعت میں داخل ہوجاؤ، خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے، انہوں نے کہا ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں۔

قہری اطاعت تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ آج آسمانوں کو توڑنا چاہیں یا زمین کو شق کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہیں تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے اور جو حکم ہوگا لامحالہ وہ واقع

(۱) سورۂ فصلت: ۱۱

ہوجائے گا۔ یہ تو اطاعت قہر یہ ہے مگر آسمان وزمین نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ تسبیح وتقدیس واعتقاد الوہیت کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ان میں جان تھوڑا ہی ہے جو انہوں نے یہ باتیں کیں۔ میں کہتا ہوں آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان میں جان نہیں ہے۔ کیوں نہیں جب قرآن میں ان کے متعلق طوع رغبت(۱) ثابت ہے تو اس کے لوازم بھی ضرور ثابت ہیں۔ حاصل یہ کہ معترض کے نزدیک اگر طوع ورغبت روح ہونے پر موقوف ہے تو ان میں بھی روح ہے مگر آپ کی سی روح ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو اتنی ضرور ہے کہ ان کو شعور ہے اور وہ قصد کرتے ہیں ذکر واطاعت کا اور صوفیاء نے تو صاف صاف کہا ہے کہ ان میں روح ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند　　با من و تو مردہ باحق زندہ اند(۲)

حکایت

مولانا نے ایک حکایت کے ضمن میں اس کو فرمایا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ ایک بادشاہ کافر بت پرست تھا۔ وہ اپنی رعایا کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا اور انکار پر آگ میں ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ ایک عورت سے بھی کہا گیا جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا۔ وہ سجدہ بت پر راضی نہ ہوئی تو اس کے بچہ کو چھین کر دہکتی ہوئی آگ کے حوض میں ڈال دیا اور کہا گیا کہ تیرا بھی یہی حشر ہوگا، وہ بیچاری گھبرا گئی۔

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت　　بانگ زد آں طفل کہ انی لم اُمت

قریب تھا کہ وہ بادشاہ کے خوف سے بت کے روبرو سجدہ میں گر پڑے مگر لڑکے نے آگ ہی میں سے پکارا کہ گھبرانا نہیں میں زندہ ہوں اور مزید برآں یہ کہنا شروع کیا:

(۱) خوش دلی سے اطاعت کرنا ثابت ہے (۲) ''خاک، ہوا، پانی، آگ یہ چاروں عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں ہمارے تمہارے روبرو گو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں''

اندر آمادر کہ من اینجا خوشم گرچہ در صورت میان آتشم
اندر آ مادر ببیں برہان حق تابہ بینی عشرت خاصان حق
اندر آ اسرار ابراہیمؑ بیں کودر آتش یافت ورد یاسمین
اندر آ مادر بحق مادری بیں کہ ایں آذر ندارد آذری
اندر آ مادر کہ اقبال آمد است اندر آ مادر بدہ دولت زدست(۱)

اور پھر ترقی کر کے اوروں کو بلانا شروع کیا:

اندر آئید اے ہمہ پروانہ وار اندریں آتش کہ دارد صد بہار
اندر آئید اے مسلماناں ہمہ غیر عذب دین عذابست آں ہمہ(۲)

ماں سنتے ہی فوراً آگ میں کود پڑی اور اس نے بھی وہی کہنا شروع کیا۔ پھر تمام لوگ لگے آگ میں گرنے۔ حتٰی کہ بادشاہ کو پولیس کے ذریعے سے لوگوں کو آگ میں گرنے سے روکنا پڑا کہ اگر یہی حال رہا تو بادشاہ کے مذہب کا بطلان شائع(۳) ہوجائے گا۔ پھر بادشاہ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو آگ سے کوئی گزند نہیں پہنچتا تو اس حالت کو دیکھ کر بادشاہ بہت گھبرایا اور غصہ میں فرضی خطاب کے طور پر کہا کہ اری آگ! آج تجھے کیا ہوگیا تو جلاتی کیوں نہیں؟ کہاں گئی تیری وہ تیزی اور گرمی اور کہاں گئی تیری قوت محرقہ؟(۴) کیا تو آگ نہیں رہی؟ حق تعالیٰ نے آگ کو زبان دی اور اس نے جواب دیا کہ:

گفت آتش من ہمانم آتشم اندر آتوتا بہ بینی تابشم(۵)

---

(۱) ''اے ماں اندر چلی آ، میں اس جگہ خوش ہوں اگرچہ ظاہر میں آگ کے اندر ہوں۔ اے ماں اندر چلی آ، برہان حق کا مظاہرہ کرتا کہ تو خاصان حق کے عیش وعشرت کو دیکھ لے۔ اے ماں اندر چلی آ اور دیکھ کہ یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے۔ اے ماں اندر چلی آ، اور مادری حق کے طفیل میں دیکھ کہ یہ آذر آذری نہیں رکھتا۔ اے ماں اندر آ کہ مقدر کا اقبال جاگ چکا ہے۔ اے ماں اندر آ اور دولت اسلام کو ہاتھ سے نہ دے''(۲)'' اے تمام مسلمانو! پروانہ کی طرح اندر چلے آؤ اور آگ کے اندر سینکڑوں بہاریں دیکھو، اے تمام مسلمانو! اندر چلے آؤ دین شیریں کے علاوہ سب عذاب ہے''(۳) بادشاہ کے مذہب کا باطل ہونا سب پر کھل جائے گا (۴) جلانے کی قوت (۵) ''یعنی میں تو وہی آگ ہوں، تو ذرا اندر آ تو تجھے معلوم ہو کہ میں آگ ہی ہوں''۔

طبع من دیگر نہ گشت وعنصرم　　تیغ حقم ہم بدستوری برم(۱)

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آگ کو حکم ہوا کہ "یٰنَارُ كُوْنِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ" وہ ٹھنڈی ہوگئی۔اسی طرح جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا کام شروع کردیا کہ کاٹ رہے ہیں اور چھری خوب تیز ہے مگر چھری کاٹتی نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غضب ناک ہوکر کہا، اری چھری تجھے کیا ہوا تو کاٹتی نہیں،تو وہ کہتی ہے مجھے آپ کیا فرماتے ہیں، آپ کو حکم ہوا ہے کاٹنے کا اور مجھے حکم ہوا ہے نہ کاٹنے کا، آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کروں گی جو کچھ کہنا ہو حق تعالیٰ سے کہیئے وہ اجازت دیں گے تو کاٹ دوں گی۔غرض کہ حکم الٰہی سے آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بے کار رہی اور چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام پر بے کار رہی۔

اس مقام پر مفسرین نے ایک علمی لطیفہ لکھا ہے کہ اگر برداً کے ساتھ سلاماً نہ ہوتا تو آگ اس قدر سرد ہوجاتی کہ پھر ٹھنڈک سے تکلیف ہونے لگتی، اس لیے حق تعالیٰ نے صرف برداً نہیں فرمایا سلامًا بھی فرمایا۔

زمین آسمان اور دیگر مخلوقات کا ادراک وعبادت

تو مولانا نے اس حکایت پر متفرع کرکے فرمایا ہے:

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند　　بامن و تو مردہ باحق زندہ اند(۲)

یہ تو حکایت تاریخی سے استدلال تھا۔آگے قصہ منصوصہ سے استدلال فرماتے ہیں:

گر نہ بودے واقف از حق جان باد　　فرق چوں کردے میان قوم عاد

تو حضرت یہ سب چیزیں ہیں اور لیجئے ارشاد ہے: أَلَمْ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ يَسْجُدُ لَهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ وَٱلشَّمْسُ وَٱلْقَمَرُ وَٱلنُّجُومُ وَٱلْجِبَالُ وَٱلشَّجَرُ وَٱلدَّوَآبُّ

(۱) "یعنی میری خاصیت نہیں بدلی لیکن میں خدا کی تلوار ہوں۔ اس کی اجازت سے کاٹ سکتی ہوں، تیری خواہش سے نہیں کاٹ سکتی"(۲) "ہوا، خاک، پانی، آگ، چاروں عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں، گو ہمارے تمہارے روبرو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں"

وَكَثِيرٌ مِّنَ ٱلنَّاسِ (۱)

یعنی یہ سب سجدہ میں مشغول ہیں۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ نے سب مخلوقات کی فہرست بتلا کر کسی میں کوئی قید نہیں لگائی مگر ہمارے متعلق فرمایا ''و کثیر من الناس'' کہ بہت سے آدمی بھی سجدہ کرتے ہیں۔ ہمیں پھسڈی (۲) نکلے کہ سوائے ہمارے اور تو سب سجدہ میں ہیں اور جب ہمارا نمبر آیا تو ''کثیر من الناس'' کی قید سے فرمایا۔

آگے دوسرے مقابل کی نسبت فرماتے ہیں و کثیر حق علیہ العذاب اور یہ ظاہر ہے کہ عبادت وسجدہ قسریہ سے کفار بھی خالی نہیں۔ اگر یہاں عبادت قسریہ مراد ہوتی تو انسان کے ساتھ کثیر کی قید نہ ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں عبادت اختیاریہ مراد ہے۔ پس اور مخلوقات تو سب کے سب خوشی سے عبادت میں مشغول بجز انسان کے کہ ان میں بہت سے تو خوشی سے عبادت کرتے ہیں اور بہت سے کافر ہیں جو عبادت اختیاریہ سے محروم ہیں اور جب آسمان وزمین، شجر ودواب نجوم وغیرہ خوشی سے عبادت کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آسمان وزمین وغیرہ میں اتنا ادراک ہے جس سے وہ حق تعالیٰ کو پہچانتے ہیں اور یہ ادراک ان کا قیامت کے قریب سب پر ظاہر ہوگا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ یہودیوں کو قتل کیا جاوے گا اور وہ چھپتے پھریں گے تو اگر وہ کسی پتھر کے پیچھے چھپیں گے تو پتھر بھی کہہ دے گا کہ اے مسلم! میرے پیچھے یہودی ہے اور پھر قیامت میں تو سب ہی بولیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا ٱللَّهُ ٱلَّذِىٓ أَنطَقَ كُلَّ شَىْءٍ (۳)

(۱) ''اے مخاطب کیا تجھ کو (عقل سے یا مشاہدہ سے) یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے (اپنی اپنی حالت کے مناسب) سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے (تو) آدمی بھی سجدہ کرتے ہیں'' سورۃ الحج:۱۸
(۲) ہم ہی پیچھے رہنے والے ہیں (۳) ''اور (اس وقت) وہ لوگ (متعجب ہوکر) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ (اعضاء) جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر (گویائی والی) چیز کو گویائی دی'' سورہ فصلت:۲۱

اور ارشاد ہے: ''يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا '' (یعنی جس دن زمین سب اترے پڑے کھول دے گی) اور دہریوں نے جو اس کا انکار کیا ہے میں کہتا ہوں ان کے پاس دلیل کیا ہے امتناع کی کچھ بھی نہیں، پھر الٹا ہم سے پوچھتے ہیں کہ تم اس کا ثبوت لاؤ اور ثبوت بھی دلائل عقلیہ سے نہیں، وہ تو ہم پیش کر چکے کہ اس کا امتناع ثابت نہیں تو امکان ثابت اور جس ممکن کے وقوع کی مخبر صادق (۱) خبر دے اس کا وقوع ثابت۔ بس اس ممکن کا وقوع ثابت ہو گیا تو پھر ہم سے ثبوت کیا مانگتے ہیں۔ نظیر لاؤ تا کہ اسے دیکھ کر استبعاد رفع کریں۔

نظیر اور ثبوت کا فرق

آج کل یہ بھی ایک جہل ہے کہ نظیر بتلانے کا نام ثبوت رکھا ہے۔ حالانکہ ثبوت نام ہے دلیل عقلی یا نقلی کا اور نظیر سے تو دلیل کی توضیح مقصود ہو جاتی ہے، نظیر سے اثبات مدعا نہیں ہوا کرتا مگر آج کل یہ الٹی منطق ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے ہیں۔

چنانچہ ایک شخص رام پور میں معراج جسمانی کا انکار کرتے تھے۔ میں نے کہا معراج جسمانی ہی تھی، روحانی نہ تھی۔ تو کہا ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ کہ کسی کو بھی ہوئی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ نظیر اثبات مدعا کے لیے نہیں ہوتی بلکہ توضیح دلائل کے لیے ہوتی ہے مگر اس کو وہ سمجھتے ہی نہیں۔ سوال تو کر دیا اور جواب سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔ اب ہم پر الزام ہے کہ علماء جواب نہیں دے سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ تم جواب سمجھ ہی نہیں سکتے ورنہ جواب سے ہم کب عاجز ہیں۔ اسی واسطے بعض دفعہ ان سے خطاب کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بقول عارف شیرازی کے:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست (۲)

غرض وہ بار بار تو یہی کہے جاتے ہیں کہ ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ۔ اس کا ایک

(۱) جس چیز کا واقع ہونا عقلاً ممکن ہو اور نبی اس کی وقوع کی خبر دے تو اس کا واقع ہونا ثابت ہوگا (۲) ''راز کا فاش کرنا مصلحتوں کے خلاف ہے ورنہ مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہ ہو''۔

اور بھی جواب ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہر واقعہ کے ثبوت کے لیے نظیر کی ضرورت ہے تو نظیر بھی ایک واقعہ ہے پھر اس کے لیے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ہے تو پھر اس کے لیے بھی اسی طرح نظیر کی ضرورت ہوگی تو پھر اس میں بھی یہی کلام ہے۔ غرض اگر کہیں سلسلہ ختم ہوگیا تو کلیہ ٹوٹ گیا اور ختم نہیں ہوا تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اور جو مستلزم محال ہے وہ بھی محال ہے مگر وہ اسے بھی نہیں سمجھتے۔

نئی ایجادوں سے تائید دین

اب ثبوت میں صرف اس کی کسر رہ گئی ہے کہ چھت پھٹ جائے اور میں اچک کر ان کے سامنے اڑ جاؤں کہ لو صاحب معراج ہوگئی۔ ایک صاحب اس پر الجھے ہوئے تھے کہ اگر معراج جسمانی ہوئی تو ہوا کے کرہ کے بعد آگ کا کرہ ہے یا یوں کہئے کہ ہوا نہیں ہے جہاں بغیر سانس لیے کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا کہ اس دعویٰ کی کہ بغیر سانس لیے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتے دلیل کیا ہے تو قاعدہ سے تو اتنا ہی جواب میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک بات دفع استبعاد کے لیے بعد میں سمجھ میں آگئی کہ سیر کی دو قسمیں ہیں۔ سیر سریعی اور سیر بطیئ یعنی ایک جلدی گزرنا اور ایک ٹھہر ٹھہر کے گزرنا۔ سو جلدی گزرنے میں استبعاد بھی نہیں کیونکہ سرعت کے ساتھ آگ سے نکل جائے تو جل نہیں سکتا۔ جیسے ایک شعلہ ہو اس کے اندر سے جلدی جلدی انگلی کو یا ہاتھ کو نکالو تو رونگٹا بھی نہیں جلے گا۔ بس اگر اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی معراج میں اس سرعت کے ساتھ پہنچا دیئے گئے کہ یہ چیزیں اثر نہ کرسکیں تو استبعاد بھی نہیں رہا۔

اسی طرح ان چیزوں کے بولنے میں امتناع عقلی تو نہیں ہے صرف استبعادی (۱) ہے اور اب تو استبعادی بھی نہیں کیونکہ روزانہ نئی ایجادیں نکلتی ہیں جن سے بہت سے مستبعدات کا مشاہدہ ہونے لگا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ ایسے لوگوں سے تائیدِ دین کا کام لیا ہے جو کافر ہیں کہ وہ نئی نئی ایجادیں کردیں جن سے بہت سے شبہات حل ہوگئے۔

(۱) عقلاً ناممکن نہیں صرف مشکل ہے۔

زمین کے بولنے کی نظیر

چنانچہ لوگوں کو شبہ تھا کہ زمین کیسے بولے گی کیونکہ وہ جمادات میں سے ہے۔ خدا نے اس کی نظیر گراموفون ایجاد کرادیا کہ یہ نہ انسان ہے نہ حیوان اور نہ نباتات اور پھر بولتا ہے۔ اب اس کو کس قسم میں داخل کروگے۔ ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک انسپکٹر تھے تعلیمات کے، وہ جہاں جاتے تھے لڑکوں سے پوچھا کرتے تھے کہ موجودات کی کتنی قسمیں ہیں بتلاؤ؟ وہ کہتے کہ تین قسمیں، جمادات، نباتات، حیوانات۔ پھر پوچھتے کہ بتلاؤ میز کس قسم میں ہے۔ اگر لڑکے نے اس کو نباتات کہہ دیا تو کہتے کہ اس میں نمو کہاں ہے اور جمادات سے کہہ دیا تو کہا یہ لکڑی ہے اور لکڑی درخت کی ہے اور درخت نباتات میں سے ہے۔ غرض بچوں کو بہت دق کرتے تھے۔ ایک لڑکا تھا بہت ذہین، اس نے کہا کہ موجودات کی چار قسمیں ہیں، حیوانات، نباتات، جمادات اور متفرقات بس جو چیز ان تین قسموں میں داخل نہ معلوم ہوئی کہہ دیا کہ یہ متفرقات میں سے ہے۔ بس اس کے بعد ان کا سوال ختم ہوگیا کہ وہ تو ان کا بھی استاد نکلا۔

بس اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے موجودات میں سے کچھ چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کو تم متفرقات میں داخل کروگے۔ مثلاً گراموفون کہ اس پر شبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ جمادات میں سے ہے تو بولتا کیوں ہے اور اگر حیوانات میں سے تو کبھی مرتا کیوں نہیں۔ حالانکہ یہ جن کی آواز کی حکایت کرتا ہے وہ تو مر کے ختم بھی ہوگئے مگر یہ نہیں ختم ہوتا۔

خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جمادات ہی میں سے ہے تو جمادات کے بولنے کا استبعاد بھی ختم ہوگیا۔ البتہ اب تک یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں مخارج کہاں ہیں اور حروف کیسے ادا ہوتے ہیں اور یہ حیرت بھی اسی لیے ہے کہ ہم اس کی حقیقت نہیں جانتے ورنہ موجدوں کو کچھ بھی حیرت نہیں۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ جس نے اس کے مؤجد کو ایجاد کیا وہ کیسا ہوگا۔

چہ باشند آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا
''وہ نگار کیسا ہوگا جس نے یہ نگار پیدا کیے''

موجد حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

اور دراصل تو گراموفون کو بھی مؤجد حقیقی نے ہی ایجاد کیا ہے۔ گو ظاہر میں ایک انسان مؤجد نظر آتا ہے کیونکہ یہ ایجاد نتیجہ ہے فعل دماغ کا اور مؤجد کا کام صرف سوچنا تھا۔ پھر سوچنے کے بعد ایجاد کا ذہن میں آنا اس کے اختیار میں نہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے اختیار میں نہیں کہ ایجاد کی صورت چار دن میں ذہن میں آجائے یا برس روز میں، اگر ایجاد کا ذہن میں آنا اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ فوراً ہی کیوں نہ سمجھ لیتا۔ سالہا سال تک ادھیڑ بن میں کیوں لگا رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور مؤجد ہے اور یہ محض واسطہ ہے۔

عشق من پیدا ومعشوقم نہاں یار بروں فتنہ او در جہاں(۱)

کام کوئی کرتا ہے اور نام کسی کا ہے

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

اور یہ ستم گاری معنی مجازی پر محمول ہے مگر اہل ادب اس مجاز سے بچتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک مرتبہ ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں یہ شعر لکھا تھا۔ تو میرے ایک بزرگ نے اس شعر کو ادب کی بناء پر کاٹ کے اس کے بجائے دوسرا شعر لکھ دیا کہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

اور میں نے ایک شعر دوسرا لکھا تھا۔ اسے باقی رکھا کہ:

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند(۲)

درحقیقت صوفیائے کرام نے اسی کو سمجھ کر کہا ہے کہ مخلوقات مظہر صفات الٰہیہ اور محض واسطہ ہیں اور فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ مقصود تو اتنا ہی تھا، باقی جوش میں بعض سے ایسے الفاظ بھی نکل گئے ہیں کہ کم فہموں کے ایمان کی صفائی ہوگئی ہے جسے

(۱) ''یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس ک تصرف جہاں کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا'' (۲) ''یعنی مشک کے بارے میں چینی ہرن کا نام لگا دیا ہے ورنہ یہ سب آپ ہی کی زلف کی خوشبو ہے''

وہ ہر شے کو خدا سمجھنے لگے۔ مثلاً

ز دریا موج گونا گوں بر آید زبیچوں برنگ چوں بر آید
گہے در کسوت لیلیٰ فروشد گہے در صورت مجنوں بر آید(۱)

حقیقت وحدۃ الوجود

یہ تو سب غلبہ حال میں نکلا ہے کہ خدا تعالیٰ کو کبھی لیلیٰ کہہ دیا اور کبھی مجنوں۔ خوب سمجھ لو۔ اور وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست اسی مسئلہ کا نام ہے۔ ان تعبیرات مجازی کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی بڑے حاکم کے پاس ایک مظلوم پہنچا اور جا کر کسی کے ظلم کی فریاد کی۔ حاکم کہتا ہے کہ پہلے پولیس میں رپورٹ لکھواؤ۔ پھر ابتدائی عدالت میں باقاعدہ چارہ جوئی کرو، وہاں تمہارے مفید نہ ہو تو درمیانی عدالت میں جاؤ، وہاں بھی نہ ہو تو پر ہائی کورٹ یا عدالت العالیہ میں رجوع کرو اور پھر جب وہاں بھی نہ ہو تو تب میرے پاس لاؤ۔ ابھی سے خلاف ضابطہ میرے پاس کیسے آ گئے تو وہ کہتا ہے کہ حضور میں نہیں جانتا پولیس وعدالت، میرے تو حضور ہی پولیس ہیں اور حضور ہی عدالت ابتدائی اور حضور ہی عدالت انتہائی۔

اب میں پوچھتا ہوں یہ کلام صحیح ہے یا غلط؟ بالکل صحیح ہے۔ اب ایک کم فہم جاہل نے بھی وہاں دربار میں یہ کلام سنا اور یہ سمجھا کہ اچھا یہ بادشاہ صاحب تو کانسٹیبل بھی ہیں، کوتوال بھی ہیں، تھانے دار بھی ہیں اور اب جو دربار میں گیا تو جا کے بادشاہ سے کہا، کانسٹیبل صاحب! السلام علیکم! اس پر اس کے اتنے جوتے لگیں گے کہ یاد کرے گا کیونکہ یہ کلام بالکل غلط ہے۔ بس یہ فیصلہ ہے وحدۃ الوجود کا۔ یہی حاصل ہے عارفین کے ان اشعار کا مثلاً

ہرچہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو(۲)

(۱) ”دریا سے رنگ برنگ کی موج اٹھتی ہے بے مثل برنگ مثل ظاہر ہوا کبھی لیلیٰ کے لباس میں اتر آیا کبھی مجنوں کی صورت میں ظاہر ہو“ (۲) ”مطلب یہ ہے کہ تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے“

اور مثلاً عارف جامی کا شعر جس میں اس کی بناء بھی بتلادی۔

لیکہ درجان فگار وچشم بیدارم توئی ہرچہ پیدامی شوداز دور پندارم توئی (۱)

پندارم سے معلوم ہوگیا کہ اس کا منشاء غلبہ خیال ہے۔ یہ نہیں کہ واقع میں ہر چیز معاذ اللہ خدا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی کے انتظار میں ہوتا ہے تو جب کوئی سامنے آتا ہے تو یوں ہی سمجھتا ہے کہ وہی آ گیا۔

اس پر لطیفہ یاد آیا کہ جب مولانا یہ شعر پڑھ رہے تھے تو ایک منکر تصوف نے کہا مولانا اگر خر پیدا شود (اگر گدھا ظاہر ہو) تو آپ نے فی البدیہ جواب دیا پندارم توئی یعنی میں سمجھوں گا کہ تو ہے۔ سبحان اللہ! جواب میں بھی اس کلیہ سے نہیں نکلے اور جواب ایسا دیا کہ مخاطب پر چسپاں ہوگیا۔ کیا ذہانت ہے اس احمق نے مولانا کے ذوق کو بھی برباد کیا۔

وحدت الوجود کی مثال سے وضاحت

غرض یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کی حقیقت اور ہمہ اوست (۲) کا عنوان ایسا ہے جیسا اس مظلوم کا بادشاہ سے کہنا کہ حضور ہمارے تو پولیس بھی آپ ہی ہیں، مجسٹریٹ بھی آپ ہی اور عدالت العالیہ بھی آپ ہی ہیں۔ تو یہ قول اس کا صحیح ہے یا غلط، اگر مجاز نہ لیا جاوے تو غلط ہے ورنہ صحیح ہے۔ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی حاکم آپ ہیں اور سب واسطہ اور برائے نام حاکم ہیں اور وہ سب آپ کے مقابلہ میں ضعیف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اقوی ہیں اور اقوی کے سامنے اضعف کچھ بھی نہیں۔ یہی مطلب وحدۃ الوجود کا ہے کہ موجود حقیقی حق تعالیٰ ہیں، باقی سب برائے نام موجود ہیں۔ اسے سعدیؒ نے خوب واضح کیا ہے:

(۱) ''یعنی چونکہ آپ میری جان ودل میں ہر وقت حاضر ہیں اس لیے میں ہر چیز کو یوں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی ہیں'' (۲) ہمہ اوست کا مطلب یہ ہے کہ ہمہ کا جو مصداق ہے وہ سب مع اپنے افعال وآثار قبضہ حق میں ہیں پس متصرف حقیقی وموجود مستقل صرف حق تعالیٰ ہیں ہمہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کل ممکنات تو موجود ظاہری ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود حقیقی یعنی موصوف بکمال ہستی نہیں ہے بجز ذات حق کے اسی کو ہمہ اوست سے تعبیر کردیتے ہیں۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید خجل شد چوں دریائے پہنا پدید

ایک قطرہ پانی کا ابر سے یہ دعویٰ کرتا چلا انامدوّر، انامنور، انامطہر کہ میں ایک کرہ کی طرح گول ہوں اور آئینہ کی طرح پاک وصاف ہوں مگر جوں ہی دریا کے قریب پہنچا تو اپنے دعوؤں سے شرمندہ ہوکر بے ساختہ کہتا ہے:

کہ جائیکہ دریاست من کیستم گراوہست حقا کہ من نیستم

جہاں دریا ہے میں کیا چیز ہوں، اس سے تو مجھ کو یہ نسبت ہے کہ اگر وہ ہست ہے تو میں نیست ہوں (۱)

واقع میں تو نیست نہیں مگر اس کے مقابلہ میں گویا نیست ہوں (۲)۔ یہ کلام تشبیہی ہے جیسے بہادری کے اظہار میں کمال مبالغہ منظور ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں ''زید اسد'' زید شیر ہے۔ اب کسی احمق نے بھی یہ سنا وہ زید کے پیچھے جاکے بیٹھا۔ ارے یہ کیا، کہا میں دُم دیکھتا ہوں کیونکہ تم نے کہا جو تھا کہ زید شیر ہے، احمق کہیں کا ارے یہ تو تشبیہ (۳) کے واسطے کہہ دیا تھا۔ سچ مچ وہ شیر تھوڑا ہی ہے۔ تو حضرت! اگر ان عنوانات کا مدلول ایسا ہی اتحاد ہے تو پھر سارے محاورات ہی بے کار جائیں گے۔ اسی محاورہ کے موافق من نیستم یہاں بھی کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری ہستی اتنی کمتر ہے کہ دریا کے سامنے مثل نیستی (۴) کے ہے۔ آگے مقصود کی تصریح ہے۔

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند کہ باہستیش نام ہستی برند

یعنی مخلوقات ہست تو ہیں مگر ایسے ہست ہیں کہ ان کے سامنے ان کو ہست کہتے ہوئے (۵) شرم آتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا حاکم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو اور بادشاہ پوچھے

(۱) اگر وہ موجود ہے تو میں معدوم ہوں (۲) حقیقت میں تو معدوم نہیں لیکن اس کے مقابلے میں معدوم ہوں (۳) بہادری میں تشبیہ دینے کے لیے کہا تھا شکل وصورت میں تھوڑا ہی تھا (۴) میرا وجود اتنا چھوٹا ہے کہ دریا کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے (۵) یعنی مخلوقات کا وجود تو ہے لیکن وجود حق کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

کہ آپ حاکم ہیں شرما کر کہے گا کہ حضور میں حضور کے سامنے کیسے کہوں کہ حاکم ہوں اگر حقیقت کے اعتبار سے کہے کہ میں حاکم نہیں تو ناشکری کی اور اگر کہے کہ ہاں حضور میں حاکم ہوں تو ادب کے خلاف دعویٰ اور گستاخی ہے کہ بادشاہ کے سامنے دعویٰ حکومت کرتا ہے۔ وہاں یہی کہنا چاہیے کہ حضور کے سامنے کیسے کہوں، حقیقت کا انکار بھی نہ کرے اور ادب کو بھی نہ چھوڑے کیونکہ جیسے دعویٰ مذموم ہے(۱) اسی طرح انکار حقیقت بھی قبیح ہے(۲) اور ایسا ہی حقیقت سے انکار ہے تو بس پھر تو کوئی یہ کہے کہ تم آدمی ہو تو یوں کہا کرو نہیں ہم تو گدھے ہیں۔

جاہلانہ تواضع

مگر یہ ایسی تواضع ہوگی جیسے میں ایک مرتبہ الٰہ آباد سے کانپور کا سفر کر رہا تھا۔ جس گاڑی میں بیٹھا تھا اس میں چند جنٹلمین آ گئے وہ سب مسلمان تھے۔ صرف ایک شخص دوسرے مذہب کا جو منصف (۳) تھا کہیں سے ان میں مل گیا۔ وہ بے فکرے تو تھے ہی آپس میں شعر اشعار کی چھیڑ چھاڑ کرتے جاتے تھے۔ اتفاقاً ان میں کسی نے ایک شعر جو پڑھا تو منصف کے منہ سے نکل گیا، جناب پھر تو فرمایئے، بس کم بختی آ گئی، ایک نے کہا آہا آپ شاعر بھی ہیں، اس نے کہا نہیں صاحب! دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ ضرور شاعر ہیں، یہ آپ کی تواضع ہے ورنہ شعر کا اعادہ نہ کراتے۔ تیسرے نے کہا جناب مسکین آپ کا تخلص ہے تو ایک کہتا ہے آہا تو یہ شعر بھی آپ ہی کا ہے کہ

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است چوں بار ہمیں برد عزیز است(۴)

یہ سب تمسخر کر رہے تھے اور مجھ سے بار بار کہتے جاتے تھے کہ معاف فرمایئے آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ اگرچہ مجھے جانتے نہ تھے، میں نے اپنے دل میں کہا حضور آپ کی یہی بڑی عنایت ہے کہ مجھ پر مشق نہیں ہو رہی۔

---

(۱) دعویٰ کرنا برا ہے (۲) حقیقت کا انکار بھی برا ہے (۳) انصاف کرنے والا جج (۴) ''مسکین گدھا اگرچہ بے تمیز ہے مگر جب بوجھ لے جاتا ہے اس وقت پیارا ہے'' (۵) پیشاب پاخانہ

غرض اس کے ساتھ ان لوگوں نے بڑی شرارت کی۔ پھر کھانا لے کے بیٹھے تو اس سے کہا، منصف صاحب آیئے کچھ گوہ موت (۵) آپ بھی کھالیجئے۔ ان میں سے ایک بولا گوہ موت کیسا، تم کھانے کی بے ادبی کرتے ہو، اس نے جواب دیا، یہ تواضع ہے، اپنے کھانے کو کھانا کہنا کبر ہے، اس لیے اپنے کھانے کو تحقیر ہی کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے۔

وحدت الوجود کی مقبولیت اور مردودیت کا معیار

تو کیا آپ اس کو بھی تواضع کہیں گے۔ یہ تو صریحاً ناشکری ہے۔ اگر بادشاہ نے کہا کہ کیا تم حاکم ہو، تو یہاں دو شخصوں کی دو حالتیں ہیں۔ ایک شخص تو اس قدر مرعوب ہے اور اس پر اس قدر اثر ہے سلطان کی عظمت کا کہ فانی فی السلطان (۱) ہے اور اگر کہہ دے کہ میں حاکم نہیں تو کچھ حرج نہیں اور ایک ایسا مغلوب نہیں ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ میں حاکم نہیں تو اس کہنے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو حکومت سے الگ کردے گا کہ یہ بڑا ناشکرا ہے کہ ہم نے تو اسے عنایت کرکے حاکم بنایا اور یہ ہماری عنایت کو مٹاتا ہے۔

اسی طرح وحدۃ الوجود میں سمجھئے کہ اگر اس پر غلبہ ہے موجود مطلق کا (۲) اور اس وقت یہ کہتا ہے کہ ہمارا وجود نہیں تو مقبول ہے ورنہ مردود۔ غرض حال مقبول اور قال محض غیر مقبول (۳)۔ اسی کو کہا گیا ہے:

مغرور سخن مشوکہ توحید خدائے واحد دیدن بود نہ واحد گفتن (۴)

تو جن صوفیاء پر غلبہ تھا حال کا انہوں نے سب کی نفی کردی۔ وہ یوں بھی کہہ سکیں گے کہ گراموفون وغیرہ کو اس مشہور موجد نے ایجاد نہیں کیا بلکہ اس نے ایجاد کیا جس نے پہلے دماغ میں ڈالا۔ پھر اس کے بیان کرنے کے لیے زبان میں حرکت دی پھر اس کے بنانے کے لیے ہاتھ میں حرکت دی جس کے سامنے موجد کی یہ حالت ہے۔

(۱) سلطان کی شخصیت میں فنا ہے (۲) اگر اس پر غلبہ ہے اللہ کے موجود ہونے کا (۳) کس پر حال طاری ہو پھر یہ کلمہ نکلے تو مقبول اور بغیر حال صرف زبان سے یہ کلمہ کہے تو نامقبول (۴) ''مغرور سخن نہ ہو اس لیے کہ توحید خدا کو واحد دیکھنا ہے نہ واحد کہنا''

رشتہ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست (۱)

تو جس کی حقیقت پر نظر پہنچ گئی اسے تو یہ کہتے ہوئے شرم ہی آوے گی کہ یہ کام میں نے کیا۔ اگر نفی کردے تو معذور ہے۔

حل اشکال

اب یہاں ایک سخت اشکال ہے کہ اگر حقیقت کے اعتبار سے افعال عبد (۲) کی بالکل نفی کردیں تو عام لوگوں پر مفسدہ (۳) کا اندیشہ ہے کہ وہ گناہ کرکے بھی اپنے کو بے خطا سمجھیں گے اور اگر ہر فعل کو اپنی طرف منسوب کرنے کی اجازت دیں تو چونکہ ہر شخص اس درجہ کا ہے نہیں جس درجہ کے عارفین ہیں تو اس اجازت میں مفسدہ ہے خود بینی (۴) کا کہ اتنے بڑے قادر کے سامنے یوں کہیں کہ ہم نے یہ کام کیا جس میں اپنے کاموں پر صریح ناز ہے۔

اس اشکال کا حل جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حق تعالیٰ نے ایسی ترکیب سے فرمایا ہے جس کے بعد اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش (۵)

اور وہ ترکیب یہ ہے کہ ارشاد فرمایا: وَلَا تَقُولَنَّ لِشَاْیْءٍ اِنِّی فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ (۶) جس کا حاصل یہ ہوا کہ یوں کہو کہ کام تو ہم نے کیا مگر خدا کے چاہنے سے کیا۔ اب دونوں شقوں کے مفاسد برطرف ہوگئے۔ سبحان اللہ! کتنا لطیف جمع ہے دونوں شقوں کا کہ نہ تو دعویٰ ہے اور نہ اپنا تبریہ (۷)۔ پس اشکال بھی رفع ہوگیا، یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ آسمان وزمین نے بھی اختیاری غلامی اختیار کی تھی۔ اسی مسئلہ میں دوسرے مضامین آگئے تھے۔

---

(۱) ''محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کردیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کردیتے ہیں'' (۲) بندے کے افعال (۳) عوام کے خرابی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے (۴) خود پسندی کا اندیشہ ہے (۵) '' دریا میں تختہ باندھ کر ڈال دیا ہے پھر کہتے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہو'' (۶) سورۃ الکہف: ۲۳۔۲۴ (۷) براءت

ادراکِ ارض وسماء

اب میں اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ اوپر یہ شبہ تھا کہ آسمان وزمین میں ادراک(۱) بھی ہے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ ہاں ادراک ہے۔ چنانچہ(قالتااتینا طائعین) ''انہوں نے کہا ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں'' سے تو استدلال گزر چکا ہے اور لیجئے ارشاد ہے: إِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۲)

اگر ان میں ادراک نہ تھا تو عذر کیسے کیا اور پھر ڈرے کیسے۔ ڈرتو فعل قلب کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت کے مناسب قلب بھی ہے اور زبان بھی ہے کیونکہ وہ چیز جس سے بولتے ہیں وہ زبان ہے اور وہ چیز جس سے ڈرتے ہیں وہ قلب ہے۔ باقی '' وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ '' (انسان نے اس کو اٹھالیا) کی کیا وجہ تھی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو عقل بھی زیادہ تھی اور ان میں مادہ محبت کا بھی زیادہ تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو اصل مابہ الامتیاز انسان میں یہ محبت ہی ہے۔

حیوان عاشق

چنانچہ جب میں کانپور میں پڑھاتا تھا تو معقولات بھی پڑھاتا تھا۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ اہل معقول، انسان کی حقیقت حیوان ناطق بتلاتے ہیں لیکن میرے نزدیک حیوان عاشق کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ فصل ایسا ہونا چاہیے جو دوسری انواع سے ممیز ہو۔ تو نطق تو انسان کے لیے اتنا ممیز نہیں جتنا عاشق کیونکہ یہ تو ملائکہ اور جنات میں بھی مشترک ہے اور عشق کا مادہ بجز انسان کے کسی میں نہیں۔ یہ مادہ عشق ہی تو تھا جس سے امانت پیش ہونے کے واسطے جو اس سے خطاب کیا گیا، اس خطاب میں ایسا خاص حظ(۳) اور کچھ ایسی عجیب لذت ہوئی کہ فوراً لینے کے لیے مستعد ہو گیا کیونکہ اس میں عشق

(۱) سمجھنے کی صلاحیت (۲) ''ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسکو اپنے ذمہ لے لیا وہ ظالم ہے جاہل ہے'' سورۃ الاحزاب: ۷۲ (۳) مزہ۔

بھی تھا اور عقل بھی۔ عشق سے تو لذت خطاب کا ادراک ہوا اور یہ سوچا کہ ایک بار کے کلام میں جب ایسا س حظ ہے تو حمل امانت سے تو بار بار کے کلام کا موقع ملے گا، اس میں کتنا حظ ہوگا۔ بس امانت یعنی احکام شرعیہ کی تکلیف کو قبول کرلیا۔ گو اس کا انجام یہ بھی ہوا کہ ''لِّيُعَذِّبَ ٱللَّهُ ٱلْمُنَٰفِقِينَ الی اٰخرہ'' (تاکہ اللہ تعالیٰ منافقوں کو عذاب دیں) مگر عشق کی وجہ سے اس کی پروا نہ کی کہ عذاب بھی بھگتنا پڑے گا، اس کو لے ہی لیا۔ حافظ شیرازیؒ کے کلام میں اسی علت کی طرف اشارہ بھی ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند(۱)

اس شعر میں یہی واقعہ مذکور ہے اور دیوانہ کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ امانت لینے کا سبب عشق ہوا۔ یہ مضمون ''حملھا الانسان''(۲) کا استطراداً آ گیا۔

حیوانات کا شعور

اصل مضمون یہ تھا کہ سموات وارض وجبال نے جو امانت لینے سے عذر کیا اور ڈر گئے، اس سے ان کا بھی ذی شعور اور ذی روح وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پس سوال جوان کے ادراک کے استبعاد(۳) پر ہوا تھا وہ حل ہوگیا اور ''اتینا طائعین'' سے انکا اختیاری غلامی کو اختیار کرنا ثابت ہوگیا اور ان کے خطاب میں جو طوعاً اور کرہاً واقع ہے اس میں اسی عبدیت اختیاری وعبدیت اضطراری کی طرف اشارہ ہے جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک غلامی تو اضطراری ہے(۴) جیسے موت بیماری وغیرہ کہ اس میں اگر اطاعت کی تو کیا کمال کیا۔ اگر نہ کرتے تو کیا کر لیتے، کمال تو اس بندگی میں ہے جو آپ کے اختیار سے ہوا اور یہ غلامی اختیاری ہے اور انسان اسی کا مکلّف ہے۔ سو صورت کے درجہ میں ہم لوگ اس عبادت اختیاریہ کو ضروری سمجھتے ہیں مگر حقیقت کے

(۱) خطاب کی لذت محسوس کی (۲) ''آسمان بار امانت اٹھا نہ سکا اس کا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام نکلا'' ''اسے انسان نے اٹھالیا'' (۳) ان کے نا سمجھ ہونے پر جو سوال تھا وہ رفع ہوگیا (۴) غیر اختیاری۔

درجہ میں ہمیں اس کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے اس لیے میں اس عبادت یعنی غلامی کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ اس کے بعد معلوم ہو سکے گا کہ آیا ہم اس درجہ کی غلامی کر بھی رہے ہیں یا نہیں۔

خالق ومخلوق کے معاملات کا موازنہ

سو اس کی سہل نظیر سمجھنے کے لیے یہ ہے کہ آپ کا کوئی نوکر ہو اور وہ آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو آپ نے خدا کے ساتھ کر رکھا ہے سو اس وقت آپ کی کیا حالت ہوگی۔ بس اسی پر فیصلہ ہے۔ اب بتلایئے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کا حکم ہے ''اقیموا الصلوٰۃ'' نماز پڑھو۔ اگر نوکر سے کہیں کھانا لاؤ اور وہ نہ لائے تو آپ کو کتنا غصہ آوے گا۔ یقیناً اُسی دن نوکری سے الگ کر دو گے۔ حق تعالیٰ کو تو اپنے بندوں کی نافرمانی پر اتنا غصہ آتا بھی نہیں جتنا ہم کو نوکروں پر آتا ہے کیونکہ انہیں محبت بھی ہے اس لیے وہ بہت سے گناہوں پر انتقام نہیں لیتے اور کبھی لیتے بھی ہیں تو بہت مہلت دے کر مگر انہیں حق تو ہے فوراً انتقام لینے کا پھر آپ کے نوکر نے آپ کی نافرمانی کی تو بتلایئے اس نے آپ کا کیا حق ضائع کیا کچھ بھی نہیں کیونکہ عقد اجارہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک جانب منافع ہوتا ہے اور ایک جانب روپیہ، نوکر اپنا منافع آپ کے ہاتھ بیچتا ہے، منافع یہ کہ کھانا پکانا، بازار جانا، سودا لانا تو نوکر رکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے اس کے منافع خریدے۔ اب آپ کے غصہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے منافع ہم کو نہیں دیئے، اس کا بدلہ یہ ہے کہ آپ اس منفعت کے برابر اس کو تنخواہ نہ دیجئے۔ مگر نہیں اس پر بس نہیں کرتے، سزا بھی دیتے ہیں ذلت کے ساتھ، نکال بھی دیتے ہیں اور پھر وہ منافع مملوک بھی کیسے ہیں کہ جب چاہے وہ نوکری چھوڑ دے۔ بس آپ کی ملک ختم اور یہاں تو منافع بھی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ہاتھ پیر بھی انہیں کے دیئے ہوئے۔ افسوس! ہم انہیں کی چیزوں سے انہیں کی معصیت (۱) کرتے ہیں۔

(۱) نافرمانی

نعمت کی ناقدری کا وبال

اسی طرح آنکھیں بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں جن کو معصیت کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کا نور بھی کیونکہ دماغ میں ایک مجمع النور ہے جو ایک نور کی نہر ہے اور ہر وقت جاری ہے اور اس میں اس قدر نور پیدا ہوتا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ برابر آنکھوں میں آتا رہتا ہے اور جوں جوں آپ نگاہ کرتے اور دیکھتے ہیں وہ ختم ہوتا جاتا ہے۔ اور دوسرا اس کی جگہ آتا رہتا ہے جیسے پانی کی نہر یا بجلی کی روشنی کہ برابر بجلی آتی رہتی ہے۔ اسی طرح نور بھی کہ اگر کسی دن دماغ سے نہ آوے تو آنکھیں پٹ (۱) ہوجاویں۔

اس پر ایک ملحد کو متنبہ کیا گیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَن يَأْتِيكُم بِمَآءٍ مَّعِينٍ (۲)

ایک ملحد نے جب یہ آیت سنی تو آپ نے قافیہ ملایا۔ اگرچہ پھر آپ ہی کا قافیہ تنگ ہوگیا کہ ''ناتی بھا بالمعول والمعین'' اگر پانی اتر جاوے تو ہم کدال اور مزدور کی مدد سے پھر نکالیں۔ تو گویا آپ نے یہ جواب دیا اللہ تعالیٰ کو اور وہاں تو عادت یہ ہے کہ (اگرچہ دیر گیرد سخت گیرد) ''اگرچہ دیر سے پکڑے مگر سخت پکڑے'' کیونکہ وہ کوئی بے تاب ہوتے نہیں کہ فوراً بدلہ لے لیں۔

خیر رات ہوئی، اب یہ سویا، خواب میں ایک فرشتہ آیا اور اس نے منہ پر ایک تھپڑ لگایا اور کہا ''ذھبنا بماء عینیك فات بھا بالمعول والمعین'' جیسے ہم نے تیری دونوں آنکھوں کا پانی زائل کردیا اسے بھی مزدور لگا کر پیدا کرلے۔ صبح اٹھا تو پٹ تھا(۳)، مولانا اسی مقام پر فرماتے ہیں اگر توبہ کرلیتا تو اس پر بھی معاف کردیا جاتا اور آنکھوں کی روشنی بحال ہوجاتی مگر قساوت کب اجازت دیتی ہے۔

(۱) اندھی (۲) ''بتلاؤ اگر پانی نیچے اتر جاوے تو کون ہے جو اسے لاسکتا ہے'' سورۃ الملک: ۳۰ (۳) اندھا ہوچکا تھا۔

رحمت خداوندی

چنانچہ اس قبول توبہ کی تائید میں ایک اور قصہ ہے کہ قارون نے جب ایک فاحشہ کو بہکایا کہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ تہمت لگانا، حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دی کہ مجمع عام میں سچ کہہ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا اور زمین سے فرمایا کہ یا ارض خذیہ کہ اے زمین! پکڑ اس قارون کو، چنانچہ وہ دھنسنا شروع ہوا، اس نے پکارا اے موسیٰ مجھے چھوڑ دے، آپ نے جوش میں پھر فرمایا یاارض خذیہ (اے زمین اسے پکڑ) وہ چلاتا تھا اور آپ برابر یاارض خذیہ (اے زمین اسے پکڑ) فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بالکل دھنس گیا۔ بعد میں حق تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! آپ اس وقت بہت غصہ میں تھے اس لیے ہم نے بھی نہیں کہا لیکن اگر وہ بجائے آپ کے ہم کو پکارتا تو ہم تو چھوڑ دیتے، کیا انتہا ہے اس رحمت کی کہ:

اگر خشم گیرد بکردار زشت چو باز آمدی ماجرا در نوشت(۱)

اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک دفعہ جب میں کانپور ہی میں تھا، تو ایک آقا اور نوکر میں کچھ بے لطفی ہوگئی۔ نوکر میرے پاس آیا کہ میری سفارش کردو، آقا بولے کہ اگر تم کہو تو معاف کردوں، میں نے کہا زور نہیں دیتا مگر ایک قصہ سن لیجئے۔ پھر یہ قصہ بیان کردیا اور یہ کہا کہ آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کی بھی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھی۔ اب آپ کو اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، میں سفارش نہیں کرتا، بھلا خدا کی سنت ہوتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر کب عمل کرسکتے تھے۔

تو حق تعالیٰ کی ایسی رحمت تھی کہ اگر وہ ملحد اپنی گستاخی سے توبہ کرتا تو ضرور معاف کردیتے اور اس کی آنکھیں پھر منور کردیتے۔

حقیقت اسباب

غرض آیت میں حق تعالیٰ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ

(۱) ''اگر برے کام پر غصہ آئے تو جب واپس آئے توبہ کرنے، ماجرا لپیٹے''

جانتے ہیں کہ اسباب عادیہ کو ہم اگر معطل کر دیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی واسطے عارفین مشاہدہ سے کہتے ہیں:

عقل در اسباب می دارد نظر عشق می گوید مسبب رانگر(۱)

تو یہ جس قدر اسباب ہیں یہ سب انہیں کے عطاء کیے ہوے ہیں مگر نام ہمارا کر دیا جیسے ہم اپنے بچوں کے واسطے بعض چیزیں ان کے خوش کرنے کے لیے نامزد کر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ کھٹولی تمہاری ہے اور یہ چوکی اس کی ہے۔ اسی طرح سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں اور محض ہمارے خوش کرنے کو ہماری طرف ان کی اسناد مجازی (۲) کر دی ہیں تو اس صورت میں بڑی شرم کی بات ہے کہ ان ہی چیزوں سے ان ہی کا مقابلہ کریں۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ جب سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں تو ہماری ملک کیسے ہوسکتی ہیں صاحبو! اس ملک کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض اسباب کے وجود پر یہ قانون مقرر کر دیا کہ اس میں فلاں شخص کو تصرف کی اجازت ہے، دوسروں کو بدوں (۳) اس کے اذن کے نہیں۔ پس یہ ہے حقیقت اس ملک کی اور اس سے ہمارے اس دعوے میں کوئی قدح نہیں ہوا۔

اگر کوئی کہے کہ اسناد مجازی میں حکمت کیا ہے۔ اگر اتنی نسبت بھی نہ ہوتی تو شاید یہ معصیت پر معصیت نہ کرتا۔ تو میں حکمت بتلاتا ہوں اور اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی ظاہر ہوجاوے گی جنہوں نے شریعت پر حقیقت کو ترجیح دی ہے۔

شریعت کی برکات

میں مناقشہ (۴) تو کرتا نہیں لیکن یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حقیقت کو اگر ترجیح ہوتی شریعت پر تو بڑا لطف ہوتا کہ ہر شخص حقیقت پر عمل کر کے ایک دوسرے کی چیز لے کر بھاگ جایا کرتا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی ہے تیری کہاں سے آئی اور اس کا جو انجام ہوتا ظاہر ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اتنی نسبت لگادی کہ جو چیز اسباب شرعیہ کے موافق کسی کو مل

(۱) ''عقل کی نظر اسباب پر ہے، عشق کہتا ہے مسبّب کو دیکھ'' (۲) مجازاً ہماری طرف منسوب کر دیا (۳) بلا اس کی اجازت کے نہیں (۴) جھگڑا۔

جائے وہ اسی کی ملک ہے۔ سو اس نسبت کے لگا دینے میں تو کہہ فلاں چیز فلاں کی ہے ایک ہی خطرہ ہے کہ بس اپنی ملک کا ناز ہی ہے جس کا علاج بھی آسان ہے اور وہاں حقیقت پر عمل کرنے میں قتل وخون ریزی ہے۔

مثلاً آپ کے پاس ایک گھوڑا ہے اور آپ اسے اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرا آدمی جو آپ سے زبردست ہو وہ کہے آپ کی ملک کدھر سے ہے کہ

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست ایں امانت چند روزہ نزد ماست(۱)

حقیقت کا فتویٰ تو یہ ہے نہیں کہ گھوڑا آپ کا ہے۔ یہ تو شریعت کا فتویٰ ہے اور تم شریعت کو مانتے نہیں۔ پھر یہ آپ کی زیادتی ہے کہ آپ دو برس سے غیر مملوک چیز پر قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ اب لائیے میرا حق ہے آخر میں بھی خدا کا بندہ ہوں۔

اس کے بعد پھر نوبت پہنچتی بچوں کی اور بیوی کی۔ تو نتیجہ یہ ہوتا کہ عالم ایک رزم گاہ(۲) ہوتا۔ ہر وقت قتل وخون ریزی کا بازار گرم رہا کرتا۔ اس وقت ہم یہ کہتے حضرت یہ سب آپ کے انکار شریعت کی بدولت ہو رہا ہے۔ غرض اس سے تو انکار نہیں کہ عالم میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا مملوک وغلام ہے مگر یہ کہنا کہ یہ فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا ہے یہ بھی خدا ہی کا حکم وکلام ہے۔ اگر اس کا کوئی اثر نہیں تو کیا خدا کا یہ کہنا بے کار ہے۔ یہ راز شریعت کی عینک نے دکھلایا ہے اگر شریعت نہ ہوتی تو عالم میں ایک فساد برپا ہو جاتا۔

جبریہ کا انجام

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں ایک جبری کا قصہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور پھل توڑ کر کھانے لگا، مالکِ باغ نے منع کیا تو کہا تو کون ہوتا ہے باغ بھی خدا کا، پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا، سو تو کون ہے منع کرنے والا۔ اس نے کہا اچھا اور اپنے نوکر سے کہا کہ لا تو رسا اور ختکا(۳)، پھر رسے سے باندھ کر خوب ہی ڈنڈے لگائے، اب تو لگا چلانے، اس نے کہا ارے چلاتا کیوں ہے میں بھی خدا کا، تو بھی خدا کا،

(۱) ”درحقیقت ہر چیز کے مالک خدا تعالیٰ ہیں جو ہمارے پاس چند دن کے لیے امانت ہے“ (۲) میدان جنگ (۳) رسہ اور سوٹا لے آ۔

رسا بھی خدا کا اور ختکا بھی خدا کا، غرض سب خدا کا۔ اب سمجھ میں آیا تو کہتا ہے۔

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار اختیار ست اختیار است اختیار(۱)

ہاں بھئی اب تو اختیار ہی اختیار ہے تو حضرت اگر شریعت نہ ہوتی تو سارے عالم میں ایسا ہی ہڑبونگ مچ جاتا۔ یہ تو شریعت ہی کی عنایت ہے کہ اس نے ملک مجازی کو بھی ان احکام میں مثل ملک حقیقی ہی کے قرار دیا ہے ورنہ پھر تو بڑا مزہ ہوتا کہ کوئی کسی کو قتل کر دیتا تو قصاص بھی نہ ہوتا اور وہ کہتا کہ قاتل تو حقیقت میں اللہ میاں ہیں پھر میرا کیا دخل۔ حضرت سچ یہ ہے کہ شریعت آپ کی آپ سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آپ سب حقیقت بھول جاتے مگر افسوس ہے اس پر بھی شریعت کی قدر نہیں کرتے۔

نوٹ: اس وعظ کا بقیہ حصہ اگلے شمارے میں چھپے گا جس کی ابتدا اس عنوان سے ہورہی ہے (حقیقی مالک اللہ ہے)۔

(۱) ''میں نے جبر سے توبہ کی اب تو اختیار ہی اختیار ہے''

أخبار الجامعة

❁ جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور کے تمام متعلقین سے گزارش ہے کہ حالیہ موسمی امراض سے جہاں دیگر اہالیانِ پاکستان متاثر ہوئے وہیں جامعہ ہٰذا کے مہتمم ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی صاحب ونائب مہتمم ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی صاحب وناظم اعلیٰ مولانا محمد میاں تھانوی صاحب اوراساتذہ وطلباء وملازمین جامعہ ہٰذا بھی متاثر رہے۔ اللہ کریم تمام اکابرین جامعہ وامّتِ مسلمہ کے تمام بیماروں کو مکمل شفاء نصیب فرمائیں۔آمین۔

❁ جامعہ ہٰذا کے تعلیمی شعبہ جات میں ششماہی امتحان کے بعد نتائج سے طلباء کو آگاہ کردیا گیا ہے ان نتائج کی روشنی میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحان جو رجب میں ہوں گے اُس کے لیے داخلہ بھیجا جاتا ہے۔

❁ جامعہ ہٰذا کے شعبہ عصری تعلیم میں ایف اے پارٹ II کا رزلٹ تسلی بخش ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ کل شرکاء امتحان 63 تھے جن میں سے فرسٹ ڈویژن 34، سیکنڈ ڈویژن 19 اور سپلی 9، فیل صفر، غیر حاضر ایک، مجموعی رزلٹ 84% ہے۔

❁ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام کل پاکستان مسابقۂ حفظ کا پہلا مرحلہ ڈویژنل مسابقہ 22 تا 24 نومبر 2022ء کو منعقد ہوگا۔جس کی میزبانی کا شرف جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور کو حاصل ہوگا اِس مسابقہ کے لیے اکابرینِ وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے بطور کنوینر حضرت ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی (مدظلہ العالی) کا انتخاب فرمایا ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کی عمر وصحت وایمان میں برکات نصیب فرمائیں۔آمین

❁❁❁

❁